راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 20 واں سال

Monthly
# Arxang
Lahore

ماہنامہ
# ارژنگ
لاہور


مدیر اعلیٰ : عامر بن علی
مدیر: حسن عباسی


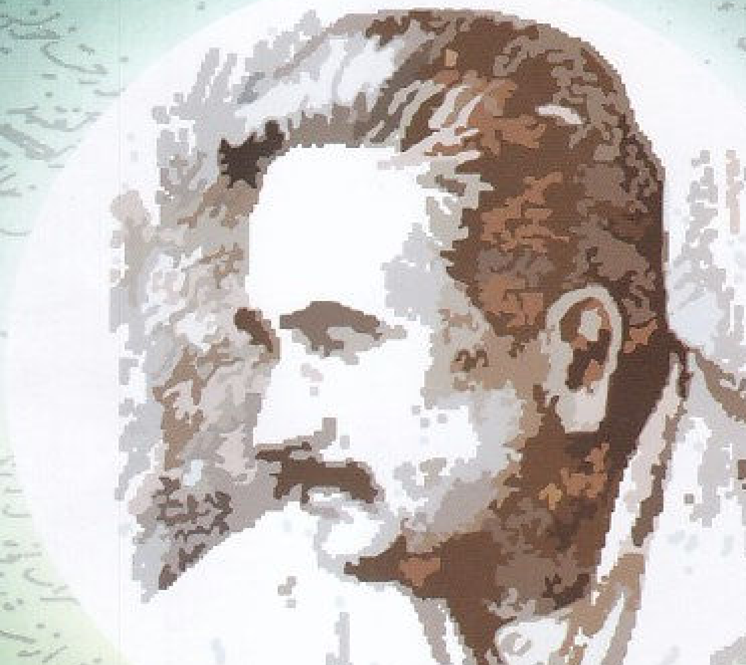

نومبر 2019ء

پاکستانی فلم انڈسٹری کے لازوال سپر اسٹار
چاکلیٹی ہیرو وحید مراد کی برسی
OF PAKISTAN
اداکار فیصل • عامر بن علی • سید منصور • سید نور • غلام محی الدین • پرویز کلیم اور عجب گل اسٹیج پر نمایاں ہیں
آل پاکستان وحید مراد لورز کلب نے تقریب کا اہتمام کیا۔
عاصمہ قادری
عامر بن علی
راجا نیر
عجب گل
غلام محی الدین
سید نور
سید وحید الحسن
فیصل
ایس ایم شاکر
ڈاکٹر صغرا صدف
سید منصور
پرویز کلیم
شوبز اور ادب سے تعلق رکھنے والی ملک کی اہم شخصیات نے تقریب میں بڑی تعداد میں شرکت فرمائی۔
Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com
Design By: 0300-4529821
MUHAMMAD AHSUN Gull

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 20 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
# ارژنگ
لاہور

جلد نمبر 20 — نومبر 2019 — شمارہ نمبر 11



مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ لبنیٰ صفدر

{مجلس مشاورت}

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (جاپان)



کمپوزنگ ● ورتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 زوہر باز ● نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ● محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

**ماہنامہ ارژنگ**

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 تارا کارزدی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مصدقہ ڈیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ، یا بی ایل او میں سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9


## فہرست


حمد و نعت، سلام / ، 2

نعتیہ گوشے:

بیگم نصرت عبدالرشید، محمد عباس مرزا، عدیل احمد آسی 4 تا 6

مضامین:

○ غالب کی جدیدیت اور انگریزی استعمار / ڈاکٹر ناصر عباس نیر ، 7
○ ایٹمی حملے کے بعد کا منظر / ڈاکٹر کوثر محمود ، 15
○ قمر رضا شہزاد کی "خامشی" کا دمدمہ / نازبٹ ، 19
○ خالد مسعود کی شاعری / نوید مرزا ، 23
○ اعظم سہیل ہارون کا گلشن تخیل اور نور کا جلوہ / عبیداللہ نزاکت ، 24
○ میرا ملتان / بابا محمد اسحاق سہوتہ ، 25
○ علامہ اقبال اور جاپان / عامر بن علی ، 26

شعری گوشے:

○ نجیب احمد، دلاور علی آزر، احمد سبحانی آکاشی 28 تا 30

افسانے

○ شہزادیاں / بشریٰ رحمٰن ، 32
○ زبیدہ لاج / سیما پیروز ، 36

سفرنامے

○ سفید بالوں والوں کا ملک / عامر بن علی ، 42
○ پہچان / ڈاکٹر سلمان عبداللہ ڈار ، 44

شاعری 47

○ بقیہ انٹرویو: ڈاکٹر تبسم کاشمیری ، 49

مختصر ادبی خبریں ، 51

تبصرہ کتب ، 52

خطوط ، 56



Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

# حمد، نعت، سلام

## حمد

نہ پاس دنیا نہ دیں ہے صاحب
نصیب اچھا نہیں ہے صاحب
سبب خرابی کا صرف میں ہوں
جہان تو بہتریں ہے صاحب
جو میرے اندر لگا دیا ہے
کمال کا دوربیں ہے صاحب
کہاں سے آتے ہیں اتنے پتھر
لہو لہو ہر جبیں ہے صاحب
ہماری خاطر ہیں آپ کافی
یہ بات کیا دلنشیں ہے صاحب
جو اُلجھنیں ہیں وہ پُرکشش ہیں
ہر ایک جھنجھٹ حسیں ہے صاحب
ملازموں کو خبر نہیں ہے
ہمارے کتنا قریں ہے صاحب
دلوں کی چوری رُکی نہیں ہے
اگرچہ اُن میں مکیں ہے صاحب

**حسن عباسی/لاہور**

گر رہا ہوں مجھے سہارا دے
بحرِ ظلمت میں ہوں کنارا دے
جو کبھی ڈوبنے نہ پائے یہاں
میری قسمت کو وہ ستارا دے
ہے اندھیرا نہ ڈگمگا جاؤں
اے خدا آسرا خدارا دے
ڈھل نہ جائے حیاتی کا سورج
دید کو طیبہ کا نظارا دے
اپنے محبوبؐ کے نواسوںؓ کا
مجھ کو اُترن دے یا اُتارا دے
زندگی ہار جاؤں تیرے لیے
یہ منافع ہے یا خسارا دے
کیا ہے بہتر مجید کیا جانے
ہے مرے واسطے جو پیارا دے

**عبدالمجید چٹھہ/لاہور**

## نعت

ہمیشہ اُلفتِ سرکار کی چاہت میں رہتا ہوں
درودِ احمدِ مختار کی چاہت میں رہتا ہوں
شرف اب حاضری کا کب مجھے آقا عطا ہوگا؟
سحر سے شام تک دیدار کی چاہت میں رہتا ہوں
یقیں مجھ کو ہے میں ہوں خادمِ سرکارِ دو عالمؐ
فضیلت کی اسی دستار کی چاہت میں رہتا ہوں
نبیؐ کی رحمتوں کی ہے عطا مجھ پر بہت پھر بھی
میں طیبہ کے در و دیوار کی چاہت میں رہتا ہوں
ہے میرے واسطے عشقِ محمدؐ بردۂ رحمت
میں ایسے بردہ ہائے نور کی چاہت میں رہتا ہوں

**سیّد مقبول حسین کرنل (ر)/راولپنڈی**

جہاں پہرا سدا ہو چاندنی کا
وہاں پر ڈر کہاں تیرہ شبی کا
نگاہوں میں مدینہ بس گیا ہے
نظارہ کر رہا ہوں ہر گلی کا
خدا کے بعد ہے اسمِ محمدؐ
مزا آیا مجھے بھی بندگی کا
مدینہ دیکھ لوں اک بار میں بھی
بھروسہ ہی نہیں ہے زندگی کا
جو بتلایا نبیؐ نے زندگی بھر
وہی تو راستہ ہے روشنی کا
غزالی بے نوا کی شاعری بھی
فقط صدقہ ہے دربارِ نبیؐ کا

**غزالی/گوجرہ**

ہے دل کی صدا آپؐ پہ اے سیدِ لولاکؐ
ہو جان فدا آپؐ پہ اے سیدِ لولاکؐ
ہے آپؐ کے سر رحمتِ کونین کا سہرا
ہے ایسی عطا آپؐ پہ اے سیدِ لولاکؐ
والعصر کی تفسیر ہوئی آپؐ سے منسوب
ہے باتِ بجا آپؐ پہ اے سیدِ لولاکؐ
قرآن تجھے معجزہ اللہ نے دیا ہے
نازل ہے ہوا آپؐ پہ اے سیدِ لولاکؐ
خالق نے بڑے پیار سے قسمیں ہیں اُٹھائیں
دیکھی جو رِدا آپؐ پہ اے سیدِ لولاک

شک اس میں نہیں کر دیے اللہ نے مسخر
ہیں ارض و سما آپؐ پہ اے سید لولاکؐ
بھیجے جو درود آپؐ پہ شمسی چاہے دارین
پڑھتا ہے خدا آپؐ پہ اے سید لولاکؐ

**سید مبارک علی شمسی/قائم پور**

میں ہمیشہ کے لیے وقفِ ثنا ہو جاؤں
کاش اے کاش، مدینے کی ہوا ہو جاؤں
آپؐ کا نام سدا میرے لبوں پر چمکے
محفلِ جاں کے لیے وجہِ ضیا ہو جاؤں
خاکِ یثرب میں بکھر جائے اگر خاک مری
حشر تک کے لیے مہتاب نما ہو جاؤں
بھیگ جائے میرا دامن بھی مرے اشکوں سے
میں بھی احساس کے زخموں کی شفا ہو جاؤں
روح، نازش مری اک سجدے میں ڈھل جائے اور
سامنے روضۂ اطہر کے ادا ہو جاؤں

**افراز علی نازش/لاہور**

## سلام

صبر تو حکمتِ امامؑ میں ہے
روشِ ظلم فوجِ شام میں ہے
دشت میں ڈھل رہی ہے ظلم کی شام
رنگِ خوں چرخِ لالہ فام میں ہے
لڑکھڑاتے ہیں پیاس سے بچے
بے بسی زندگی کے جام میں ہے
بے ردا بیبیاں پریشاں ہیں
کس قدر تشنگی کلام میں ہے
کس کی خاطر ہے مضطرب زینبؑ
کون جلتے ہوئے خیام میں ہے
آگ سے کھینچ لائی عابدؑ کو
یہ قدم نصرتِ امامؑ میں ہے
قافلہ شام کے اسیروں کا
جانے کس منزل و مقام میں ہے
صبر مظلوم کا نتیجہ ہے
کھل کے روئے نہ کر سکے ماتم
یہ ادب مرقدِ امامؑ میں ہے
نہ ہوا آپؑ پر فدا منصور
یہ خلش آپؑ کے غلام میں ہے

**مظفر حسن منصور/خوشاب**

نبیؐ کے پیارے نواسوں کا ذکر کرتے ہیں
اے کربلا ترے پیاسوں کا ذکر کرتے ہیں
وہ جن کے پیراہن افلاک سے اُترتے تھے
ہم ان دریدہ لباسوں کا ذکر کرتے ہیں
نویں کی رات ہے، میں اور نینوا کی زمیں
اُداس ہو کے اداسوں کا ذکر کرتے ہیں
چراغ گل تھے مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا
ہم ان سراپا سپاسوں کا ذکر کرتے ہیں
حسینؑ کوفہ و بغداد چیخ چیخ کے پھر
یزید موقع شناسوں کا ذکر کرتے ہیں
خلاصہ یہ ہے حسینؑ آپ جیسا کوئی نہیں
مورخین پچاسوں کا کر کرتے ہیں
گداگروں کی طرح والیانِ صبر و رضا
حسینؑ تیرے اثاثوں کا ذکر کرتے ہیں

**مسعود احمد/اوکاڑا**

دور دور تک ہر سو بے رُخی تھی موسم کی
چاند تھا محرم کا اور عید تھی غم کی
ایک ایک قطرے کو اس قدر سنبھالا تھا
شاہِ کربلا نے تو آنکھ بھی نہیں نم کی
ظلم و جبر کے آگے صبر اوڑھ کر آیا
نیزے پر فروزاں تھی آن بان پرچم کی
اشقیاء کے لشکر کو پھر پناہ کیا ملتی
بجلیاں سی گرتی تھیں تیغِ شاہ جب چمکی
کربلا کے موسم میں بھی امامؑ نہ ڈولے
کر سکی کہاں مرعوب ان کو ظلم کی دھمکی
صد سلام ہوں اس پر جس نے کہ جلیل اپنا
سر کٹا لیا عظمت دین کی نہیں کم کی
پیاس کا گو صحرا تو تھا جلیل ہونٹوں پر
دیدنی تھا صبرِ شاہ چاہے پیاس تھی یم کی

**جلیل احمد/اوکاڑا**

نیزے پہ سر چڑھا ہے تو آئی صدا سلام
اُس ربِ ذوالجلال نے مجھ کو کیا سلام
خیمے جلا دیے گئے کربل میں ایک ساتھ
بچے جو رو پڑے تھے دیا یوں گیا سلام
مقتول اس طرح سے تو دیکھے نہیں کہیں
تقسیم ہو کے مومنوں سے یوں لیا سلام
پامال لاشے ہو گئے شاہؑ نے کیے تلاش
عرشِ بریں بھی ہل گیا کہنے لگا سلام
مقبولؔ سانس سانس میں غم آپؑ کا رہے
مولا بروزِ حشر کو دے گا خدا سلام

**مقبول ذکی مقبول/منکیرہ (بھکر)**

# بیگم نصرت عبدالرشید

بیگم نصرت عبدالرشید کی کلیاتِ نعت ''وہی اول وہی آخر ﷺ'' سے انتخاب

زندگی کے رشتے ناتے مدھم پڑتے جارہے ہیں اور ایک نادیدہ اور ناموجود جہان کی سمت ہجرت کی ساعت سر پر کھڑی ہے۔ اس تنہائی، اس خلا، اس اُداسی کا سامنا اس شاعرہ کو ہے۔ ایک مخصوص معاشرے میں زندگانی کی رایگانی کا خیال اور احساسِ عصیاں۔ اس صورتِ حال میں رسولِ کریم ﷺ کی یاد ہے جو شاعرہ کی جذباتی بے آسرگی کا مداوا بنتی ہے اور ایک ان دیکھی دُنیا کی طرف سفر کو آسان بناتی جاتی ہے۔ بیان اور اظہار کی سچائی کا احساس اس گزرگی شاعرہ کے کلام میں جا بجا ملتا ہے۔ شبِ سیاہ کے آسمان پر کوژ بخت ستاروں کی جھلملاہٹ کی طرح۔ (منیر نیازی)

آمنہ کی گود میں جب نورِ یزداں آ گیا
ساتھ لے کر رحمتیں محبوبِ رحماں آ گیا
سیدالابرار اُمت کا نگہباں آ گیا
عاصیوں کے واسطے بخشش کا ساماں آ گیا
مہرِ تاباں آ گیا مہرِ درخشاں آ گیا
بزمِ دنیا میں چراغِ نورِ عرفاں آ گیا
عاشقو! مژدہ کہ تسکینِ دل و جاں آ گیا
شاہِ داور آ گیا جنت کا ساماں آ گیا
نورِ حق تھا منتظر جس کا وہ انساں آ گیا
جان میں جاں آ گئی جب جانِ جاناں آ گیا
جس کے آنے کی بشارت حضرت آدم نے دی
حق کا پیارا آ گیا اسریٰ کا مہماں آ گیا
مٹ گئیں تاریکیاں ظلمت کدے دُھندلا گئے
نور جلوہ گر ہوا مہرِ درخشاں آ گیا
بے کسوں کا چارہ گر اور گمرہوں کا راہبر
بن کے اللہ کا پیامی لے کے قرآں آ گیا
فخرِ آدمؑ فخرِ عیسیٰ فخرِ موسیٰ فخرِ نوحؑ
جس کی کرنیں ہیں نبی وہ فخرِ تاباں آ گیا
ساقیِ تسنیم و کوثر تشنہ کاموں کے لیے
اپنی آنکھوں میں لیے صہبائے عرفاں آ گیا
تیرے دل کی بزم میں نصرتؔ خدا کا شکر ہے
عشقِ احمدؐ ہمرہِ انوارِ ایماں آ گیا

گلستانِ آمنہؓ میں جب کھلا وحدت کا پھول
شادمانی ہر طرف تھی، رحمتوں کا تھا نزول
ذرہ ذرہ جھک گیا تشریف لائے جب رسولؐ
ہر ادائے دلنشیں جن کی خدا کو تھی قبول
صف بہ صف حور و ملک آئے سلامی کے لیے
انبیاء بے چین تھے جن کی غلامی کے لیے
موجزن تھا اس گھڑی رحمت کا بحرِ بیکراں
آپؐ جلوہ گر ہوئے ٹوٹیں بتوں پر بجلیاں
کفر و ظلمت کا عرب سے مٹ گیا نام و نشاں
نورِ احمدؐ سے منور ہو گیا سارا جہاں
قصرِ کسریٰ ہل گیا کافر پریشاں ہو گئے
بت گرے سجدے میں اور بت خانے ویراں ہو گئے
جہل کی تاریکیوں میں کفر کے پندار میں
کھو گئی انسانیت جب گمرہی کے غار میں
تیغِ حق چمکی تھی دستِ احمدِؐ مختار میں
مچ گئی دہشت سے ہل چل لشکرِ کفار میں
جا چھپے غاروں میں شیطاں خوف سے تھرا گئے
چھوڑ کر بے رہ روی اک راہ پر سب آ گئے
مرحبا اے تاجدارِ انبیاء خیرالبشر
تو حبیبِ کبریا تُو نورِ ایزد سر بہ سر
تیرے تابع مہر و ماہ و بحر و بر برگ و شجر
نصرتِ خاطر گرفتہ پر بھی رحمت کی نظر
عاصیہ ہوں رحم کر اے رحمۃ اللعالمین
ضامنِ روزِ جزا ہے تو شفیع المذنبین

یا محمدؐ تاجدارِ نورِ عرفاں آپؐ ہیں
منبعِ جود و سخاوت ظلِ رحماں آپؐ ہیں
گنجِ انوارِ الٰہی چشمۂ فیض و عطا
محرمِ اسرارِ حق فخرِ رسولاں آپؐ ہیں
ہادیٔ راہِ یقیں ہیں اور شفیع المذنبیںؐ
یامحمدؐ پردہ پوشِ اہلِ عصیاں آپؐ ہیں
باعثِ تکوینِ عالم زینتِ کون و مکاں
شاہکارِ بزمِ امکاں نورِ یزداں آپؐ ہیں
ظلمت و کفر و توہم کی گھٹاؤں میں حضورؐ
ماہِ تاباں آپؐ ہیں قندیلِ عرفاں آپؐ ہیں
جن کے آنے کی بشارت حضرت آدم نے دی
نورِ حق تھا منتظر جس کا، وہ انساں آپؐ ہیں
حسنِ قدرت ابرِ رحمت بے نظیر و بے مثال
نازنینانِ جہاں میں شاہِ خوباں آپؐ ہیں
آپ سردارِ دو عالم ہیں میرے پیارے نبیؐ
رہبرِ ہر انس و جاں ہیں فخرِ دوراں آپؐ ہیں
نام پیارا آپؐ کا وجہِ قرارِ روح ہے
باعثِ تسکینِ دل ہیں جانِ جاناں آپؐ ہیں
میرے آقاؐ میرے مولاؐ میرے ہادیؐ رہنما
میری حسرت میرے دردِ دل کا درماں آپؐ ہیں
جا رہی ہوں جانبِ محشر میں اس اُمید پر
نصرتِ زار و حزیں کے بھی نگہباں آپؐ ہیں

# محمد عباس مرزا/لاہور

محمد عباس مرزا کے مجموعہ نعت "آقا آقا" سے انتخاب

یہ محبت جو سرِ عرش نمایندہ ہے
عشقِ احمدؐ کی قسم میری ہی کارندہ ہے

جبلِ رحمت پہ کھڑا، دیر سے آقاؐ کا غلام
ایک منظر کے عیاں ہونے کا جوئندہ ہے

آج بھی حسنِ سماعت میں وہ رس گھولتا ہے
طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا کا سازندہ ہے

بند آنکھیں کرو بے شک میں وہیں جاؤں گا
گنبدِ خضریٰ مری روح میں تابندہ ہے

اب معافی کو ملے اذن کہ دل شاد کرے
میری توبہ تو بڑی دیر سے شرمندہ ہے

کوئی پیغام تو لائی ہے بڑے صاحب کا
ایک تتلی جو بڑی دیر سے رقصندہ ہے

اک ٹھکانہ ہے جو نعلین میں ہے جلوہ کناں
آس ہے اور سرِ حشر بھی پایندہ ہے

اُس طرح کا میں کبھی بن ہی نہیں پایا حضورؐ
اپنی تحریف پہ یہ بندہ تو شرمندہ ہے

بند ہونٹوں پہ جو لرزاں ہے سلام اور درود
اس کا مطلب ہے کہ عباس ابھی زندہ ہے

---

شور اتنا تھا بتوں کا، قبر سے آذر اُٹھا
فتحِ مکہ پر چھڑی کی نوک سے محشر اُٹھا

میں تو تھا مایوس، در پہ حاضری کے جشن سے
اتنے میں تائید کو تقدیر کا اختر اُٹھا

صاحبِ کردار ہونا معجزہ تھا اور لوگ
صرف اتنا دیکھتے وہ ان میں سے بہتر اُٹھا

جس کی تابانی میں ہو تائیدِ معراجِ نبیؐ
دور میری آنکھ کی خاطر کوئی منظر اُٹھا

تیرا استحقاق ہے، سب سے زیادہ دید کا
اے محبت! تو بھی آگے ہو کے اپنا سر اُٹھا

ایک ایسا فرد جو جی جان سے اچھا لگے
میری اس خواہش کی ہر تکمیل کا محور اُٹھا

آپؐ کے نقشِ قدم کا خاک پر اندازہ کر
اور پھر آنکھوں سے اور ہونٹوں سے یہ منظر اُٹھا

سب خطائیں باندھ کر غرقابِ اشکِ غم کریں
بائیں جانب کے فرشتے تو میری چادر اُٹھا

میں بڑھاتا ہوں ادھر ترسیلِ ذکرِ مصطفیٰؐ
ذہن کے جس گوشے میں بھی دیکھتا ہوں شر اُٹھا

---

تنہا آنچل تیرا تو اک چہرہ تھا
تجھ کو یہ اعزاز نبیؐ نے بخشا تھا

وہ صورت تو خالق کی مطلوب تھی
جس کو تو نے اپنے اندر دیکھا تھا

وہ اک غار کی کرنوں پہ کیوں مرتا ہے
سورج کا تو اپنا ایک حوالہ تھا

کالی کملی کے بھی رنگ انوکھے تھے
پھولوں نے جو اوڑھا ایک دوشالہ تھا

نظریں تھیں نعلین پہ، سر کے کہنے پر
خود کو ان کے نوکر میں جو ڈھالا تھا

سر کی جو گولائی ہے اک گنبد سے
ہاتھوں پہ بھی سبزی مائل چھالا تھا

دو انڈے بھی وحی سناتے رہتے ہیں
غار کے منہ پر ایک سنہری جالا تھا

جون بدلتی دیکھی اہلِ دنیا نے
تو نے بندر کو پیکر دے ڈالا تھا

تجھ پہ جو بھی لکھا جائے وہ کم ہے
اعلیٰ تھا تو بے شک بے حد اعلیٰ تھا

ڈیٹ ہوئی طے گنبدِ خضریٰ کے نیچے
میں جو اپنی روح سے ملنے والا تھا

---

آسماں سے روشنی بھی خوب ہے، کیا خوب ہے
ان کے روضے سے لپٹتی ہے مجھے محبوب ہے

چاند کا اعزاز ہے یہ حکم اُنگلی نے دیا
ورنہ انؐ کا تو ارادہ ہی فقط مطلوب ہے

اُس کے ٹکڑوں نے تری شاہی کے ٹکڑے کر دیے
تو نے سمجھا تھا کہ یہ بس عام سا مکتوب ہے

ایسا حلیہ اور کوئی بھی بتا سکتا نہیں
اُمِ معبدؓ، جو تمہارے نام سے منسوب ہے

جاگتا ہے نعرۂ محبوب پر قوت کے ساتھ
یہ ترا عاصی جو اپنے جسم میں مجذوب ہے

یہ صفائی کے لیے دُم دار تارہ ہی سمجھ
مسجدِ نبوی میں جس کے ہاتھ میں جاروب ہے

سرزنش تو آپؐ نے تا عمر فرمائی نہیں
بس کہ چہرے سے عیاں ہر خوب اور ناخوب ہے

نعت میں بھی ایک سرشاری ہے لہراتی ہوئی
آنسوؤں کا مسکرا دینا مرا اسلوب ہے

اک کھجوروں سے مزین شہر ہے دل میں کہیں
گھومنا پھرنا مجھے گرچہ بڑا مرغوب ہے

# عدیل احمد آسی/ڈنمارک

عدیل احمد آسی کا کلام ان کے اولین نعتیہ مجموعہ "ذکرِ رسالت مآب ﷺ" سے لیا گیا ہے۔ جسے حال ہی میں ادارہ نستعلیق مطبوعات، لاہور نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ منگوانے کے لیے رابطہ کریں: 0300-4489310

ذکرِ نبیؐ بنا ہے جب سے ترانہ میرا
گرویدہ ہو گیا ہے تب سے زمانہ میرا
اُلفت میں آپؐ کی میں لکھتا رہوں گا نعتیں
جب تک لکھا ہوا ہے یاں آب و دانہ میرا
نہ اور کوئی گھر ہے نہ اور کوئی در ہے
اب تو درِ نبیؐ ہے بس آستانہ میرا
محشر کا خوف کیسا پوچھا اگر خدا نے
عاشق ہوں آپؐ کا میں یہ ہے بہانہ میرا
حاجت نہیں ہے کوئی اب مال و زر کی مجھ کو
لاکھوں درود کا ہے اب تو خزانہ میرا
جب بھی کہوں محمدؐ جب بھی پکاروں احمدؐ
ہو جائے اس گھڑی ہی موسم سہانا میرا
بس اتنی میری حسرت بس اتنی میری خواہش
آسی مدینے میں ہو مر کر ٹھکانہ میرا

زباں پہ ذکرِ رسالت مآب آئے گا
کرم خدا کا تو پھر بے حساب آئے گا
علیؑ خود اپنی ہی تھے سوزِ چشم پر قرباں
انہیں پتہ تھا نبیؐ کا لعاب آئے گا
دُعا قبول تو ہونا تھی میرے آقاؐ کی
وہ جانتے تھے کہ ابنِ خطابؓ آئے گا
ملے گا سایہ کبھی عاشقانِ احمدؐ کو
کہ روزِ حشر میں جب آفتاب آئے گا
ہم اُنؐ کے دامنِ سیرت کو تھام کر رکھیں
کہ آگے اور زمانہ خراب آئے گا
اُمید باندھی ہوئی ہے مدینے والے سے
سو خالی شاخ پہ اک دن گلاب آئے گا
کبھی تو میری سُنی جائے گی عدیل آسی
کبھی تو اُنؐ کی طرف سے جواب آئے گا

جسم مطہر خیر مجسم
صلی اللہ علیہ وسلم
ذات مقدس حُسنِ دو عالم
صلی اللہ علیہ وسلم
نام مبارک اسمِ اعظم
صلی اللہ علیہ وسلم
نورِ دل ہیں درد کا مرہم
صلی اللہ علیہ وسلم
والیٔ کوثر والیٔ زمزم
صلی اللہ علیہ وسلم
آپؐ مؤخر آپؐ مقدم
صلی اللہ علیہ وسلم
شاہِ رُسل ہیں مرسلِ خاتم
صلی اللہ علیہ وسلم
آسی جیسوں کے ہیں ہمدم
صلی اللہ علیہ وسلم

گر چاہیے ہے تجھ کو شفاعت رسولؐ کی
پھر صدقِ دل سے کر تو اطاعت رسولؐ کی
بعد از خدا تو مرتبہ بس آپؐ ہی کا ہے
کیسے بیاں مجھ سے ہو عظمت رسولؐ کی
ہیں شاہِ دو جہاں کی غذا سوکھی روٹیاں
یہ سادگی رہی ہے معیشت رسولؐ کی
محفوظ کر لیں سینوں میں اپنے بھی ہم اسے
رب کا کلام تو ہے امانت رسولؐ کی
جتنا بھی اس پہ فخر کروں کم ہے دوستو
شامل ہے میرے نام میں نسبت رسولؐ کی
مولا کریم اپنا کرم کر تو رات دن
مشکل میں رات دن ہے یہ اُمت رسولؐ کی
خوش بخت خوش نصیب صحابہؓ ہیں کس قدر
دیکھی انہوں نے آنکھوں سے صورت رسولؐ کی
اُس کے لیے ہیں دونوں جہاں کتنے خوش نما
مل جائے آسی جس کو محبت رسولؐ کی

زیست میں میری اُن کی سیرت کے ہوں خد و خال
میری زیست بھی بن جائے دنیا میں ایک مثال
میری سوچ کا مرکز محور ہو سیرت اُنؐ کی
لکھوں میں احوال انہی کا دے وہ حُسنِ خیال
میرے عمل کی نسبت میرے آقاؐ سے ہو بس
ہو جاؤں میں صرف انہی کا ہو جائے یہ کمال
اُمت کی پستی کے غم میں، میں ہی کڑھتا ہوں
سب کو اپنے اپنے گناہوں پر ہو کاش ملال
میری اذانیں اُن کے نام سے گونجیں پانچ پہر
اور مصیبت میں بن جائے اُن کا نام ہی ڈھال
خواب میں آئیں اور لحد میں ہو دیدار نصیب
آسی کو حاصل ہو مولا ایسا لطف وصال

# غالب کی جدیدیت اور انگریزی استعمار

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر/لاہور

بیسویں صدی میں عام طور پر غالب کو اردو کا پہلا جدید شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ مثلاً یوسف حسین خاں کے بہ قول: ''غالب اردو زبان کے پہلے جدید شاعر ہیں....ان کی غزل اور نثر دونوں نے جدید اردو ادب کی ابتدا کی''۔۱ ان سے پہلے حالی، عبدالرحمٰن بجنوری، میراجی، راشد اور چند دوسرے لوگ بھی غالب کی جدیدیت کی نشان دہی ایک یا دوسرے طریقے سے کر چکے تھے۔ اسی طرح منٹو کو غالب سے غیر معمولی دل چسپی تھی۔ بعد میں غالب کی جدیدیت کو وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی اور شمیم حنفی نے واضح کیا۔

مرزا اسداللہ خاں غالب (۱۷۹۷ء۔ ۱۸۶۹ء) کا بچپن آگرہ میں، باقی عمر دہلی میں گزری۔ غالب چودہ پندرہ برس کی عمر میں جس وقت دہلی پہنچے ہیں، اس وقت ایک فقرہ کثرت سے دہرایا جاتا تھا: ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا''۔ اس کا سیدھا سادہ مطلب تھا کہ خلق خدا، بادشاہ اور ملک تینوں اسی کے رحم و کرم پر ہیں جس کا حکم چلتا ہے۔ پندرہ سالہ شادی شدہ مرزا نوشہ، اسداللہ جب (۱۸۱۲ء) دہلی آئے ہیں تو اس کے تخت پر اکبر شاہ ثانی متمکن تھے، سکہ بھی انھی کے نام کا چلتا تھا مگر حکم کمپنی بہادر کے نمائندے چارلس مٹکاف کا چلتا تھا۔ غالب کے لیے اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔ دہلی میں غالب کے لیے یہ بات دل چسپ موازنے کا باعث ضرور رہی ہوگی، مگر حیرت انگیز نہیں کہ بادشاہِ دہلی بھی ان ہی کی مانند انگریزی حکومت کے وظیفہ خوار تھے۔ بعد میں غالب کی زندگی جس ڈھب سے گزری، وہ بڑی حد تک 'بادشاہ دہلی، اور قلعہ معلیٰ' کی زندگی سے مماثل تھی!

غالب کے چچا نصراللہ بیگ (جنھوں نے ان کے والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش کی، اور جو مغلوں نہیں مرہٹوں کی ملازمت میں تھے) آگرہ کے قلعہ دار تھے، انھوں نے ''بغیر لڑائی کے آگرہ کا قلعہ جنرل لیک کے حوالے کر دیا تھا''۲۔ نصراللہ بیگ نے لڑنے کے بجائے ہتھیار ڈالنے، اور کمپنی بہادر سے انعام پانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ ان کا ذاتی یعنی شخصی 'انفرادی' فیصلہ نہیں تھا، بلکہ اس زمانے کے اشراف کے عمومی انتخاب کی ہو بہو نقل تھا جنھیں اپنی بقا، انگریزوں یا مرہٹوں میں سے ایک کی سرپرستی میں نظر آتی تھی۔ نصراللہ بیگ کو نواب احمد بخش، والی لوہارو فیروز پور جھرکہ کی طرف سے پیغام بھیجا گیا تھا، جس میں مزاحمت نہ کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ نواب احمد بخش، نصراللہ بیگ کے بہنوئی تھے، اور غالب کے سسر نواب الٰہی بخش معروف کے بڑے بھائی تھے۔ اس 'خدمت' کے صلے میں نصراللہ بیگ کو چار سو سوار کی رسالداری، سترہ سو ماہانہ مشاہرہ اور جاگیریں ملی تھیں۔ راجہ بختاور سنگھ، والی الور نے غالب اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف بیگ کے لیے روزینہ مقرر کیا تھا، اور دو گاؤں ان کے نام کیے تھے۳۔ نصراللہ بیگ کے انتقال کے بعد جنرل لیک نے جاگیریں واپس لے لیں اور ان کے خاندان کی پنشن مقرر کردی تھی۔ جس نواب احمد بخش کے پیغام پر نصراللہ بیگ نے آگرے کا قلعہ لیک کے حوالے کیا تھا، نصراللہ بیگ کے انتقال کے بعد انھی سے جنرل لیک نے کہا کہ جاگیروں کے بدلے ان کے خاندان کو دس ہزار روپے سالانہ پنشن ملا کرے گی۔ نواب صاحب نے پنشن کی رقم نہ صرف نصف کردی، بلکہ نصراللہ بیگ کے پس ماندگان میں خواجہ حاجی نامی ان کے ملازم کو بھی شامل کردیا، جس کے لیے دو ہزار روپے کی رقم سالانہ مختص کی، جب کہ غالب اور نصراللہ بیگ کی بیوہ کے لیے ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار مقرر کی۔ یہ وہ اینٹ تھی جو ٹیڑھی رکھی گئی، اور غالب کی آئندہ زندگی کا سب سے بڑا روگ بنی۔ غالب نے اپنے باپ دادا کی مانند سپاہیانہ زندگی کا انتخاب کرنے کے بجائے، انھی کی پنشن پر گزارا کرنے کا فیصلہ کیا، اور یہ پنشن ہی تھی، جو انگریزوں سے ان کے تعلق کا واحد سبب اور وسیلہ تھی!

غالب کو وراثت میں ایک طرف انگریزوں کی جاری کی ہوئی خاندانی پنشن ملی، اور دوسری طرف انگریزی حکومت کی طرف داری۔ غالب خود کہتے ہیں: ''بچپن سے انگریزی حکومت کے نان و نمک سے پرورش پائی ہے، اور جب سے منھ میں دانت نکلے ہیں، ان فاتحین عالم کے دستر خوان کا ریزہ چین ہوں''۴۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب نے انگریزی حکومت کے علاوہ، انگریزی پنشن پر گزارہ کرنے والی مغل حکومت کا نان و نمک بھی کھایا، اور جہاں سے نان و نمک کی امید ہو سکتی تھی، وہاں کوششیں کیں۔ غالب جب دہلی آئے ہیں تو ان کی سب سے بڑی آرزو مغل دربار تک رسائی، اور استاد شاہ بننے کی تھی، جو کہیں تیس سال بعد، ذوق کے انتقال (۱۸۵۴ء) کے بعد پوری ہوئی۔ اپنے زمانے کی مقتدر قوتوں تک رسائی، تاکہ ان سے اپنے شاعرانہ مرتبے کی سند بہ صورت اعزاز و خطاب و خلعت حاصل کی جا سکے: یہ تھی غالب کی

زندگی کی عملی جدوجہد۔ انھوں نے ملکہ معظمہ، شاہ دہلی اور بادشاہ اودھ کی خدمت میں قصائد ارسال کیے۔ سب کا مضمون ایک تھا: انعام واعزاز وخطاب وخلعت کی آرزو۔

حقیقت یہ ہے کہ غالب کی یہ دونوں آرزوئیں، نہ محض ایک شاعر کی عمومی آرزوئیں ہیں، نہ انیسویں صدی کے اشراف طبقے سے تعلق رکھنے والے اس شخص کی آرزوئیں ہیں جسے اپنا وقار اور اپنی معاشی بقا دونوں خطرے کی زد پر محسوس ہو رہی تھیں، بلکہ یہ آرزوئیں، ایک عظیم نصب العین کی اس تخفیفی صورت کو بیان کرتی ہیں، جس کی زد پر قلعہ معلی تھا۔ غالب کی شاعری مغل جمالیات کو پیش کرتی ہے، بالکل بجا، مگر غالب کی زندگی عظیم مغلیہ سیاسی نصب العین کے انحطاط سے حیرت انگیز طور پر مماثل ہے۔ پنشن میں اضافے اور تیموری وقار کی بحالی کی درخواستیں.....شاہ عالم ثانی سے بہادر شاہ ظفر تک سب تیموری 'بادشاہوں' کی مساعی انھی دو باتوں تک سمٹ گئی تھیں۔ یہ درخواستیں انگریز ریزیڈنٹ، گورنر جنرل اور انگلستان کی مرکزی حکومت تک (رام موہن رائے جنھیں راجہ کا خطاب لال قلعے نے دیا تھا، یہ درخواست لے کر گئے تھے) پہنچائی جاتی رہیں۔ یہی کام غالب بھی کرتے رہے۔ جو سلوک غالب کی پنشن سے ہوا، وہی سلوک لال قلعے کے مکینوں کی درخواستوں سے ہوتا رہا۔ شروع میں انگریز ریزیڈنٹ مغل دربار کے آداب کا لحاظ کرتا رہا، یعنی نذر پیش کرتا رہا اور تسلیم بجا لاتا رہا، بعد میں انھیں بھی ترک کر دیا گیا۔ انیسویں صدی کے شاہان مغلیہ کی قلعہ معلی کے اندر حکمرانی برقرار تھی۔ " قلعے کے بازار کے مکین بادشاہ کے محکوم تھے، اور شاہی خاندان کی فوج ظفر موج کو شاہی سفارتی استثنا حاصل تھا۔ شاہی آداب کا پاس کیا جاتا تھا، عظیم مغل بادشاہوں کے خطابات اور زبان برقرار تھی ....اگرچہ پورے ہندوستان میں مغلوں کو پنشن یافتہ کہا جاتا تھا، مگر قلعے کے اندر انھیں خود مختاری حاصل تھی"۵۔ اگر ہم قلعہ معلی کی تمثیل کو غالب کی زندگی کو سمجھنے کی کلید بنا لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ جو خود مختاری تیموری شاہان کو قلعے کے اندر حاصل تھی، اسی سے ملتی جلتی خود مختاری غالب کو اپنی شاعری میں حاصل تھی۔ بس ایک اہم فرق تھا دونوں میں۔ قلعے کے اندر کی دنیا کی خود مختاری 'معمائی' یعنی Problematic تھی؛ اسے مغل بادشاہوں نے تین صدیوں کی بہترین عسکری اور ثقافتی پالیسیوں کی مدد سے تخلیق کیا تھا، لیکن وہ پہلے مرہٹوں اور اب انگریزوں کے رحم و کرم پر تھی۔ حقیقت میں یہ خود مختاری، ایک نہایت کمزور سمجھوتے کے سہارے قائم تھی، جسے شاہ عالم ثانی تا بہادر شاہ ظفر انگریزوں سے کرتے چلے آرہے تھے، اور جس میں ۱۸۰۳ء سے لے کر ۱۸۵۷ء (سوائے سوروزہ آزاد حکومت کے ) کے عرصے میں بس ایک ہی تبدیلی دیکھنے میں آئی تھی؛ یہ کہ خود مختاری مسلسل سکڑتی جارہی تھی۔ دوسری طرف غالب کی شاعری کی خود مختار دنیا میں انگریز کا عمل دخل نہیں تھا۔ نام کے مغل شاہان دربار کے آداب ہوں کہ اپنے جاں نشین مقرر کرنے کی روایات ....ان میں سے کسی شے کی حفاظت نہ کر سکے۔ اس عہد میں واحد غالب تھے، جنھوں نے مغل ہندوستانی جمالیات اور شعریات کی نہ صرف حفاظت کی، بلکہ ان کی داخلی تخلیقی صلاحیت کو منتہائے کمال تک پہنچایا۔

دہلی میں غالب کے شب و روز وہی تھے جو ہندوستانی اشراف کے تھے۔ حویلی، ملازمین، عمدہ لباس، عمائدین شہر سے بہ اہتمام ملاقاتیں؛ کھیل، علمی مجالس، مشاعرے اور شراب۔ یہی طبقہ اشراف ایک طرف اپنی وضع داری قائم رکھتا تھا، اور دوسری طرف نئے خیالات، نئے بندوبست، نئے مواقع سے استفادے پر ہمہ دم مائل رہتا تھا۔ غالب نے نو دس برس کی عمر میں شاعری شروع کی تھی۔ کلکتہ جانے سے پہلے تک وہ اردو ہی میں لکھتے رہے، سوائے چند فارسی رباعیات کے۔ ہم غالب کے انگریزوں اور یورپی کلچر سے تعلق کو سمجھنے کی جو کوشش کر رہے ہیں، اس کے تناظر میں دیکھیں تو اردو شاعری غالب کے لیے اطمینان کا باعث ہوگی۔ انگریزوں کی طرف سے خالص سیاسی مصلحتوں سے نہ صرف رفتہ رفتہ فارسی رخصت کی جارہی تھی، بلکہ اس کی جگہ اردو کی سرپرستی کی جارہی تھی۔ دہلی میں قلعے سے باہر کچھ اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ۱۷۹۲ء میں مدرسہ غازی الدین حیدر سے شروع ہونے والا، اور ۱۸۲۵ء میں کالج بننے والا، دہلی کالج، ان تبدیلیوں کا ایک مرکز تھا۔ اردو قارئین کے حافظے میں" دہلی کالج علامت ہے، انگریزوں اور ہند مسلم کلچر کے مابین رابطے کی، جو اردو کے ذریعے قائم ہوا"۶۔ اردو مؤرخوں نے مبالغے سے کام لیتے ہوئے اس کالج کو مغرب و مشرق کے درمیان رابطے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اصل سوال یہی ہے کہ مذکورہ رابطے کی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ ایک ایسا ادارہ تھا، جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی استعماری حکمت عملی کے کارفرما ہونے کی راہ مسدود کر دی تھی، اور جہاں یورپی اور مشرقی علوم قدری اور افادی سطحوں پر برابر سمجھے گئے تھے، اور جس تحقیری رویے کا اظہار لارڈ میکالے کی یادداشت میں ہوا، اس کا شائبہ یہاں موجود نہیں تھا؟ دوسرے لفظوں میں یہ کالج اردو

میں منتقل ہونے والے جدید یورپی علوم کے ذریعے ثقافتی برتری کا احساس دلانے کا منشا رکھتا تھا یا اس جدیدیت کی روشنی پھیلانا چاہتا تھا جس کے علم بردار برطانوی حکام تھے؟ اکثر مؤرخوں نے ان سوالوں سے صرفِ نظر کیا ہے۔ تاہم مذکورہ سوالوں کے جواب چند حقائق سے مل سکتے ہیں۔ ۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید کرتے وقت یہ شق شامل کی گئی کہ وہ ایک لاکھ روپیہ ''علم و ادب کے احیا، ہندستانی علما کی حوصلہ افزائی اور علم و سائنس کو ہندستان کے برطانوی مقبوضات کے باشندوں میں رائج کرنے'' پر خرچ کرے گی۔ دس سال تک اس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ جب عمل درآمد شروع ہوا تو دہلی کالج کے لیے پانچ سو روپیہ ماہانہ مقرر کیا گیا جس میں ایک سو پچھتر روپے (بعد میں تین سو روپے) پرنسپل کی تنخواہ، ایک سو بیس روپے ہیڈ مولوی کی تنخواہ اور دو دو مولوی پچاس پچاس روپے کے رکھے گئے ۸۔ بعد میں دیسی مولویوں کی تنخواہیں دس روپے تک رہیں۔ ۱۸۲۹ء میں نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خان بہادر وزیر اودھ نے ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم سے کالج کے لیے وقف قائم کیا۔ یہ رقم اس وعدے کے ساتھ لے لی گئی کہ نواب صاحب کے نام سے پروفیسروں کا تقرر ہوگا اور اور طلبا کے لیے وظائف جاری ہوں گے۔ ایک سال بعد نواب صاحب کا انتقال ہو گیا مگر یہ رقم کالج پر کبھی خرچ نہ ہو سکی۔ ۱۸۳۵ء میں طے ہوا کہ ''آئندہ [رقوم] دیسی لوگوں میں انگریزی زبان کے ذریعے انگریزی علم ادب اور سائنس کی اشاعت میں صرف کی جائیں''۹۔

یہاں تفصیل سے اس موضوع پر بحث کی گنجائش نہیں۔ ہم خود کو غالب کے ضمن میں اٹھائے گئے اس سوال تک محدود رکھنا چاہتے ہیں، جو غالب کی جدیدیت کے ضمن میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے لیے دہلی میں اگر واقعی کچھ نیا تھا تو اس کا تعلق اسی کالج سے تھا۔ غالب کے چند قریبی احباب اس کالج سے وابستہ تھے۔ امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہ۔ لیکن یہ حضرات اس کالج میں اپنے روایتی علوم کی تدریس پر مامور تھے، یعنی ان کے پاس جو کچھ 'نیا' تھا وہ یورپی الاصل نہیں، مشرقی الاصل تھا۔ اسی کالج میں غالب کو فارسی کے استاد کی پیش کش ہوئی۔ غالب نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ غالب کا استقبال نہیں ہوا۔ خود غالب نے بھی اپنے خط میں یہی وجہ بیان کی ہے۔ لیکن کیا واقعی وجہ صرف یہی تھی؟ غالب کے انکار کو محض ان کی انانیت سے تعبیر کرنے کے بجائے، کچھ اور باتوں کو بھی ملحوظ رکھنا مناسب ہوگا۔ پہلی بات یہ کہ دہلی کالج کے بارے میں مسلمانوں میں یہ رائے عام تھی کہ وہ ایک خیراتی ادارہ ہے۔ مولوی عبدالحق نے دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''مسلمان شرفا، نواب اور سلاطین دلی کالج کو ایک خیراتی درس گاہ تصور کرتے تھے، اور اس بنا پر اپنے بچوں کو وہاں تعلیم کی غرض سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے''۱۰۔ جس خیراتی ادارے میں مسلمان شرفا اپنے بچوں کو داخل نہیں کراتے تھے، اس میں 'شریف غالب' کیسے پڑھانا پسند کر سکتے تھے؟ نیز اگر دہلی کالج واقعی مشرق و مغرب کے درمیان یا کم از کم انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھا تو غالب کو اور کیا چاہیے تھا؟

دہلی میں مغربی اثرات سے جو ایک نئی چیز رفتہ رفتہ وجود میں آ رہی تھی، اور دہلی کی ثقافتی، ذہنی زندگی میں تبدیلی لا رہی تھی، وہ دہلی سے جاری ہونے والے اردو اخبارات تھے، اور لیتھو پریس تھا۔ خاص بات یہ ہے کہ اخبارات کا اجرا دہلی کالج کے اساتذہ اور سابق طلبا کا مرہون ہے۔ ۱۸۳۵ء میں دہلی میں پہلا سنگی مطبع قائم ہوا، اور دو برس بعد دہلی کالج کے فارغ التحصیل مولوی محمد باقر نے دہلی اردو اخبار کے نام سے اخبار جاری کیا۱۱۔ بعد میں دہلی کالج کے پرنسپل شپرنگر (قران السعدین) اور اسی کالج سے تعلیم یافتہ ماسٹر رام چندر (فوائد الناظرین، محب ہند) نے بھی اخبارات جاری کیے تھے۔ بہ قول طاہر مسعود ''اردو اخبارات کے اجرا و ترقی میں انگریزوں اور اس کے افسروں کی امداد، تعاون اور سرپرستی کا خصوصی دخل تھا''۱۲۔ اس کا ایک اثر دہلی کی ثقافتی زندگی پر یہ پڑا کہ ایک نیا اجتماعی تخیل پیدا ہونا شروع ہوا، جس کی باگ ڈور اخبارات کے ہاتھ میں عمومی طور پر اور چھپے ہوئے لفظ کے ہاتھ میں خصوصی طور پر تھی۔ یہیں سے چھپے ہوئے لفظ پر اختیار کی کش مکش بھی شروع ہوئی۔ غالب نے اپنا دیوان ۱۸۳۳ء میں مرتب کیا تھا مگر اس کی اشاعت ۱۸۴۱ء میں مطبع سید الاخبار سے ہوئی تھی۔ غالب کے لیے دیوان کی اشاعت ایک نیا تجربہ تھا، جسے یورپی ٹیکنالوجی نے ممکن بنایا تھا۔ اس کے ذریعے ان کا کلام ان لوگوں تک بھی پہنچا، جن سے غالب آشنا نہیں تھے۔

دہلی میں غالب کی گزر بسر انگریزی پنشن پر تھی، تاہم وہ قلعہ معلٰی سے تعلق استوار کرنے کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔ شاید اسی بنا پر خلیق انجم نے لکھا ہے کہ ''ان [غالب] کی وفاداری بھی منقسم تھی۔ وہ ایک طرف تو بادشاہ سے قربت حاصل کرنے کے لیے تمام ذرائع استعمال کرتے نظر آتے ہیں اور دوسری

طرف قصیدے لکھ لکھ کر انگریز افسروں کو بھی خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں'' ۱۳۔ غالب کی معاشی جدوجہد کے سلسلے میں 'وفاداری' کا لفظ شاید مناسب نہیں، البتہ 'طرف داری' کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ خود غالب نے کہہ رکھا ہے:

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اسی سے ملتی جلتی بات میر نے بھی کہی ہے:

مر رہیں اس میں یا رہیں جیتے
شیوہ اپنا تو ہے وفاداری

گویا وفاداری میں استواری، استقلال کے ساتھ جاں کو نثار کرنے کا وافر جذبہ بھی ہوتا ہے۔ غالب بہ طور شاعر وفاداری کے معنی سے واقف ہی نہیں تھے، اس معنی کو پر شکوہ بنانے کے بھی قائل نظر آتے ہیں، نیز اپنے خاندان، اپنے بھائی، اپنے نوکروں اور اپنے احباب کے ضمن میں وہ وفاداری کے جذبات رکھتے تھے، مگر مقتدر لوگوں کے سلسلے میں نہیں۔ لہٰذا یہ بات غلط نہیں کہ ''جب تک ہندوستان کا پلہ بھاری رہا، غالب قلعے جاتے رہے، اور جب ہندوستانیوں کو شکست ہو گئی تو غالب انگریزوں کے ساتھ ہو گئے'' ۱۴۔ اپنے خاندانی بزرگوں اور اس زمانے کے اکثر اشراف کی مانند غالب کے لیے سیاسی وفاداری کا تصور، استواری کی شرط نہیں رکھتا تھا۔ ان کے خاندان کی تلوار کی طرح، ان کی تیغ مدح کو اپنا ممدوح اور سرپرست تبدیل کرنے میں عار نہیں تھا۔ وہ شاعری میں تقلید بزرگاں کے قائل نہیں تھے، مگر عملی زندگی میں تھے۔

اپنے قصائد اور دستنبو میں غالب نے جس طرح بڑھ چڑھ کر انگریزوں کی طرف داری کی ہے، اور اپنی طرف داری کو حق پر مبنی ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے، وہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ پہلے دستنبو سے کچھ اقتباسات دیکھیے:

اس جہاں سوز منحوس دن میرٹھ کی کینہ پرور فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سپاہی شہر میں آئے۔ یہ سب بے حیا اور مفسد اور نمک حرامی کے سبب انگریزوں کے خون کے پیاسے۔ شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ جوان فسادیوں کے ہم پیشہ اور بھائی بند تھے، بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ پہلے ہی ان محافظوں اور فسادیوں میں سازش ہو گئی ہو، شہر کی حفاظت اور ذمے داری اور حق نمک ہر چیز کو بھول گئے ۱۵۔

اے انصاف کی تعریف کرنے والے اور اور ظلم کو برا کہنے والے حق پرستو! اگر ظلم کی مذمت اور انصاف کی تعریف میں تمھاری زبان اور تمھارا دل ایک ہے تو خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرز عمل یاد کرو۔ اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد اور عداوت کا کوئی سبب ہو (ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اٹھائی جو گناہ ہے..... سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں ان انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلہ لینے) کے لیے لڑنے اٹھے اور گناہگاروں کو سزا دینے کے لیے لشکر آراستہ کیا، چوں کہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو اس کا موقع تھا کہ (شہر پر) قابض ہونے کے بعد کتے بلی (تک کو) زندہ نہ چھوڑتے۔ (اگر چہ) ان کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی، لیکن انھوں نے ضبط کیا ۱۶۔

غالب نے 'جنگ آزادی' کو بغاوت ہی کا نام نہیں دیا، ہندوستانی فوج کی سخت ترین الفاظ میں مذمت بھی کی۔ اسے کینہ پرور، بے حیا، مفسد، نمک حرام کہا۔ اسی پر بس نہیں کی۔ ظلم و انصاف کو سمجھنے والوں اور ظلم کو برا کہنے والوں کو مخاطب کر کے یہ باور کرانے کی کوشش بھی کہ ہندوستانی تلوار اٹھا کر بے وفائی کے مرتکب ہوئے، اور گناہ کیا۔ دوسرے لفظوں میں ستاون کی رستخیز میں غالب، ہندوستانیوں کے ساتھ نہیں، انگریزوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کو اپنے ترک سلجوقی ہونے پر فخر تھا، مگر ان کی روح ہندوستانی تھی؛ وہ روح جس کا اظہار ان کی شاعری میں ہوا ہے، اور ان کی عام اخلاقی سماجی زندگی میں ہوا ہے۔ پھر غالب نے ان 'کافر فرنگیوں' کا دفاع کیوں کیا، جنھوں نے ہندوستان کی دولت و حشمت کھینچ لی تھی، اور جس کا اثر خود غالب پر بھی پڑا؟ [بہ قول مصحفی: ہندستاں میں دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی /کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی]۔ اس کا جواب آسان نہیں۔ تاہم جواب تلاش کرنے کی کوشش کرنے میں حرج نہیں۔

غالب کی انگریزوں کی طرف داری کا دفاع نہیں کیا جاسکتا۔ صرف اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی جاسکتی ہے کہ ایک ایسا شاعر جو انسانی ہستی کے رموز کا عارف ہو، جو اشیا کے عارضی پن کا عرفان رکھتا ہو، جس کی نظرِ تخیل میں دنیا بازیچہ اطفال ہو، جو دنیا، سماج، مذہب کے کبیری بیانیوں پر استفہام قائم کرنے کی جرأت رکھتا ہو، وہ کیوں کر استعمار کار کی حمایت میں رطب اللسان ہوتا ہے؟ زیادہ تر لوگوں نے اس ضمن میں غالب کی کہن سالی اور ضعف کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، لیکن یہ کافی کمزور اور سادہ لوحی پر مبنی دلیل ہے۔ اوّل یہ کہ کیا ضعیفی اور کہن سالی مزید جینے کے لالچ کا دوسرا نام ہے؟ دوم، اس دلیل میں جسمانی طاقت اور اخلاقی جرأت کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ سقراط

سے برٹرینڈ رسل تک کئی بوڑھوں نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ گمان غالب ہے کہ غالب عدم تحفظ کے نفسیاتی عارضے کا شکار تھے، جو معاشی طور پر منحصر ہونے کی اس حقیقت کا نتیجہ تھا جو برابر غیر یقینی کا شکار تھی۔ یہی وہ عارضہ تھا جو انھیں پنشن کی بحالی کو زندگی کی بڑی جدوجہد بنانے کی تحریک دیتا تھا۔ غالب کی حقیقی زندگی میں ہم جس عملی جدوجہد کو دیکھتے ہیں، اور اس دوران میں ان کی مایوسی، ناکامی، انا کی شکست، مصائب پر مصائب کو آشکار ہوتا دیکھتے ہیں، وہ سب پنشن کے اس قضیے سے پھوٹتا ہے، جس کا تعلق انگریزی حکومت سے تھا۔ غالب کی اس جدوجہد میں وہی سرگرمی، جرأت، اور اپنی بہترین جسمانی و ذہنی توانائیوں کو صرف کرنے کا عمل دکھائی دیتا ہے جو ایک عظیم جدوجہد کے تصور کے بغیر ممکن نہیں۔ سب سے عظیم جدوجہد 'بقا' کی ہے۔ غالب کے لیے بقا بہ یک وقت معیشت آوز آبرو کا مفہوم رکھتی تھی۔ غالب اشراف کے طرز زندگی اور اعتراف عظمت کے طور پر خلعت و خطاب کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔

علاوہ ازیں یہی وہ عارضہ تھا جو انھیں قومی سطح کے واقعات کو بھی خالص شخصی نظر سے دیکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ دستنبو ہی میں غالب نے لکھا ہے کہ ''میں جانتا ہوں کہ اگر ہندوستان کا نظم و نسق (غدر میں) تباہ نہ ہوتا اور ناخداترس اور ناشکرے سپاہیوں کے ہاتھوں عدالتیں نہ اجڑ جاتیں تو گلستان انگلستان سے ایسا فرمان صادر ہوتا جس سے مرادیں پوری ہو جاتیں اور میری آنکھیں اور میرا دل دونوں ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے''۱۷۔ ہندوستان کی تاریخ و تقدیر کو بدل کر رکھ دینے والے واقعے کی بابت یہ رائے وہی شخص دے سکتا ہے جسے اپنے تحفظ کا خوف بے بس کر دینے والا ہو۔ اپنے تحفظ کے خوف کا شکار شخص، سماجی زندگی میں فعال کردار ادا نہیں کر سکتا۔ چوں کہ وہ تباہی کے ڈر سے برابر دوچار رہتا ہے، اس لیے جیسے ہی تباہی کے مناظر دیکھتا ہے تو اس کا دل بری طرح افسردہ ہو جاتا ہے۔ دہلی کی تباہی پر غالب کی افسردگی کو اسی تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

دل ہے، پتھر یا لوہے کا ٹکڑا نہیں، کیسے نہ بھر آئے؟ آنکھیں ہیں، روشندان یا دیوار میں سوراخ نہیں کہ آنسو نہ بہائیں۔ ہاں حکمرانوں کی موت کا غم منانا چاہیے اور ہندوستان کی ویرانی پر رونا چاہیے۱۸۔

بعض نے غالب کی طرف داری کی توجیہہ میں اشتراکی دلیل سے کام لیا ہے۔ ان کے مطابق غالب جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اس کے مفادات انگریزوں سے تھے۔ مثلاً شمیم طارق کہتے ہیں کہ غالب نئے روشن خیال طبقے کے فرد تھے، جن کی دولت و سماجی حیثیت کا دارومدار انگریزوں کی دولت پر تھا، اس لیے انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ شمیم طارق کا یہ بھی خیال ہے کہ غالب کی کسی تحریر سے واضح نہیں ہوتا کہ انھوں نے ''عزت کی زندگی کے لیے ملک کی آزادی کو ضروری سمجھا ہو، حالاں کہ ان کے سامنے احیا پسند مجاہدین اور حریت پسند سپاہیوں کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے، جو انگریزوں سے مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کے باوجود ان کی مخالفت یا ان سے بیزاری کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے''۱۹۔ ان میں مفتی صدر الدین آزردہ اور امام بخش صہبائی قابل ذکر ہیں۔ دونوں غالب کے دوستوں میں شامل تھے۔ اس دلیل میں وزن ہے۔ بایں ہمہ چند دوسری باتوں کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ ایک یہ غالب کی فرنگیوں کی حمایت کا جائزہ اس قومی شعور کے تحت لیا گیا ہے جو انیسویں صدی ہی میں پیدا ہوا تھا، اور سب سے پہلے بنگال میں۔ ادیب و دانش ور کی ذمہ داری کا سوال بھی اسی قومی شعور کی راست پیداوار ہے۔ انیسویں صدی کے بعد سے قوم پرستی، قومی شعور، قومی احساس، حب الوطنی آسیب کی طرح ہماری ہر فکر پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ غالب ہی کے زمانے میں قومی شعور بیدار ہونے لگا تھا، مگر غالب اس میں شریک نہیں تھے۔ بجا کہ غالب جب کلکتہ گئے، تب وہاں راجہ رام موہن رائے کی اصلاحی تحریک چل رہی تھی۔ یہ بھی درست کہ غالب کی دلی پر جس سال (۱۸۰۳ء) لارڈ لیک نے قبضہ کیا، اسی سال دہلی کے شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ اسی طرح غالب ہی کے ہم عصر مومن نے سید احمد شہید کی تحریک میں باقاعدہ شرکت کی غرض سے مثنوی لکھی.... لیکن غالب ان سب سے دور رہے۔

قصہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر سے ہم نے ادیب و شاعر و دانشور کی شخصی اور ذہنی زندگی دونوں کے سلسلے میں ایک اصول تسلیم کر لیا ہے کہ اس نے 'قومی و سماجی' ذمہ داری کس حد تک ادا کی۔ یہ اصول نو آبادیاتی اصلاحی تحریکوں (جن کی نمائندگی اردو میں انجمن پنجاب اور علی گڑھ تحریک نے کی، اور بیسویں صدی میں اشتراکی منشور کے ساتھ ترقی پسند تحریک نے کی) کی دین ہے، جنھوں نے ادیب کی شخصی اور ذہنی زندگی کو سماجی زندگی، اور اس سے بھی بڑھ کر اس ڈسکورس کے تابع کرنے کا بیڑہ اٹھایا، جسے نو آبادیاتی جدیدیت کا نمائندہ بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ ایک اور بات بھی تھی۔ یہ اصول نہ تو اس علمیات سے اخذ کیا گیا

تھا، جو شاعری کی تفہیم کے لیے صدیوں سے چلی آتی تھی، اور جسے غالب نے بھی جذب کر رکھا تھا، اور نہ اس نفسیاتی عمل میں یہ اصول جڑیں رکھتا تھا، جو شاعری کا محرک ہوتی ہیں۔ البتہ اس میں لکھے ہوئے لفظ کی اس طاقت کا ادراک ضرور موجود تھا، جس کی ضرورت کا احساس تازہ تازہ ظہور میں آنے والی قوم پرستی نے دلایا تھا اور جس کے لیے کچھ ضعیف سی شہادتیں قدیم عربی شاعری سے حالی کو ملی تھیں۔ ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں غالب کے لیے یہ اصول سرے سے وجود ہی نہیں رکھتا تھا۔ وہ جس شعریات کے تحت شاعری تخلیق کر رہے تھے، وہ مادی و ذہنی زندگی، یا دنیویت و مابعد الطبیعیات میں تفریق نہیں کرتی تھی۔

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
ہرزہ ہے نغمہ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئنہ فرق جنون و تمکیں

اس ضمن میں ایک اور نکتہ بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ غالب کو قومی انقلابی خیالات سے عاری ثابت کرنے کے لیے ان کی نثر کو بنیاد بنایا گیا ہے، اور شاعری سے بہت کم تعرض کیا گیا ہے، سوائے ان دو چار اشعار کے۔

بس کہ فعال مایرید ہے آج
ہر سلح شور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا

ان اشعار کا مضمون وہی ہے جسے غالب اپنے اردو خطوط اور دستنبو میں بھی پیش کر چکے ہیں۔ دہلی کی تباہی پر ملال کا اظہار۔ دہلی کی تباہی اس استعماری عمل کا نقطۂ عروج کہی جا سکتی ہے، جس کا باقاعدہ آغاز غالب کی پیدائش سے کم و بیش پچاس پہلے ہو چکا تھا، اور جسے ایک یا دوسرے طریقے سے غالب اپنی معاشی جدوجہد میں بھگت رہے تھے۔

غالب، یا کسی بھی شاعر کے لیے اس کی شاعری ان سب سوالوں سے نبرد آزما ہونے کا تخیلی میدان ہوتی ہے جو اسے حقیقی طور پر درپیش ہوتے ہیں، اسے دعوت مبارزت دیتے ہیں، اس کی بشری استعداد کا امتحان ہوتے ہیں، اس کے شعور کی حدوں کو پگھلانے لگتے ہیں، اور اس کے سماجی رشتوں اور بندھنوں کے بنے بنائے تصورات پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔ تخیلی میدان، حقیقت سے مکالمے، حقیقت کو پلٹانے، حقیقت سے گریز اور حقیقت کی نئی تشکیل اور نئی حقیقت کی تخلیق کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر تخیل محدود ہو، یعنی محض شخصی نظر سے اوجھل چیزوں کا، یا سنی سنائی باتوں کا خیال منفعل انداز میں باندھ سکتا ہو یا تصور کر سکتا ہو تو وہ حقیقت کی تشکیل تو دور کی بات ہے، وہ حقیقت سے مکالمہ کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم ہوتا ہے؛ لیکن جس شاعر کا تخیل وسیع ہو، یعنی تاریخ اور اجتماعی یادداشت سے اوجھل چیزوں کا فعال انداز میں تصور کر سکتا ہو، اور ان میں نئی ترتیب پیدا کر سکتا ہو، اور تاریخ و یادداشت میں موجود چیزوں کے باہمی رشتوں کو توڑ کر، ان میں نئے رشتوں کو جنم دے سکتا ہو، وہ حقیقت کے سلسلے میں وہ سب کر سکتا ہے، جس کی طرف اشارہ اوپر کیا گیا ہے۔ تخیلی میدان میں حقیقت سے مکالمہ لازماً تاریخی جہت رکھتا ہے۔ یعنی شعری تخیل اور سماجی و تہذیبی حقیقت کے بیچ 'تاریخیت' موجود ہوتی ہے۔ تاریخیت کو ہم مخصوص تاریخی لمحے یا صورتِ حال سے شاعری کی اس کشمکش، مصالحت، زیر ہونے یا پلٹانے جیسے متضاد رویوں کا نام دے سکتے ہیں، جس سے وہ اپنی شاعری میں نہ صرف معنی پیدا کرتا ہے، بلکہ معنی کو استحکام بھی دیتا ہے، اور وہ مستحکم معنی، اس مخصوص تاریخی لمحے کے اندر اپنا جواز حاصل کرتا ہے۔

غالب کی شاعری کو اس تناظر میں دیکھیں تو وہ تین طرح سے اس استعماری تاریخی لمحے (جو رفتہ رفتہ بننے کے عمل سے نقطہ عروج تک پہنچا) سے نبرد آزما ہوتی ہے۔ یعنی تین طرح کی حکمت عملی اختیار کرتی ہے۔ پہلی حکمت عملی 'سپر نہ ڈالنے' سے عبارت ہے۔ غالب انگریزی طور طریقوں کی تعریفیں کرنے کے باوجود، انگریزی شاعری، اور یورپی فکر کو سمجھنے کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ وہ جس انگریزی آئین کو 'جدید' سمجھتے تھے، اور جسے اپنے زمانے کی حقیقت قرار دیتے تھے، اور یہ بھی خیال کرتے تھے کہ وہ ایک سیل کی طرح ہندوستانی آئین کو بہالے جانے والی ہے، اسے انھوں نے اپنی شعریات کا حصہ نہیں بنایا۔ وہ سرسید کو تو اس جانب متوجہ کرتے ہیں، مگر خود اپنے ذہن کو اس سے الگ رکھتے ہیں۔ کیوں؟ غالب کا شعری تخیل جب اس نئی تاریخی حقیقت سے دوچار ہوتا ہے تو سپر نہ ڈالنے کا فیصلہ کرتا ہے، اور اس لیے کرتا ہے کہ اس کے پاس سپر ہے، یعنی اپنی جدید شعریات! غالب کو اپنی شعریات کے قدیم ہونے کا احساس سرے سے تھا ہی نہیں۔ غالب خود کو خود اپنے پیش رو فارسی و اردو شعرا سے الگ سمجھتے تھے۔

ہم یہ تصور نہیں کر سکتے کہ غالب کی شاعری

جس تہذیب کی پیداوار تھی، اور جس کی نمائندگی ان کی شاعری میں ہو رہی تھی، غالب اس تہذیب پر استعماری یلغار کو محسوس نہ کرتے ہوں، اور اس کے ضمن میں ایک خاص طرز عمل اختیار کرنے کی انھیں فکر نہ ہو۔ غالب سماجی ومعاشی سطح عدم تحفظ کا شکار ضرور تھے، مگر شعری تخلیلی سطح اور شعریات کی سطح پر کسی کمزوری کا شکار نہیں تھے؛ وہ بلاشبہ غیر معمولی وسیع تخیل کے حامل تھے۔ کہنے کا مقصود یہ نہیں کہ غالب نے شاعری میں اپنی نثر کے برعکس لکھا ہے، اور انگریزوں کی مذمت کی ہے۔ اگر ایسا کرتے تو اپنی شاعری کی قربانی دیتے۔

غالب نے انگریزوں کی طرف داری کی، انگریزی آئین اور دخانی تہذیب کی بھی تحسین کیا، لیکن کیا خود بھی انگریزی ریورپی تہذیب سے بھی استفادہ کیا؟ مغربی جدیدیت کی طرف سرسید کو متوجہ کرنے کے سلسلے میں غالب کے سفر کلکتہ کا ذکر خاصا کیا جاتا ہے۔ غالب کے اس سفر کا محرک، اپنی خاندانی پنشن کی بحالی کی امید تھی۔ اکبر شاہ ثانی کی دلی میں بھی اگر چہ حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا، مگر کمپنی کے بڑے صاحب بہادر کلکتہ میں تھے، جو انگریزی حکومت کا صدر مقام تھا۔ غالب ۲۰ فروری ۱۸۲۸ء کو ''فیروز پور، کان پور، لکھنو، باندہ، الہ آباد، بنارس، عظیم آباد اور مرشد آباد سے ہوتے ہوئے، کلکتہ پہنچے'' ۲۰۔ یہ ایک طویل صعوبت بھرا سفر تھا، اور غالب کو کچھ ایسے 'معارف' سے آگاہ کرنے کا وسیلہ بنا، جن سے اکتیس سالہ غالب بے خبر تھے۔ اسی سفر کے دوران میں غالب پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ شاعر کو معاشی وسماجی زندگی کے تلخ حقائق کے ساتھ ساتھ اپنی ادبی برادری سے بھی معرکہ درپیش ہوتا ہے، اور وہ آدمی کی کمر توڑ سکتا ہے۔ اس معرکے کی یاد گار مثنوی بادمخالف ہے۔ یہ وطن سے دور ایک بڑے شاعر کی طرف سے آشتی کا پیغام تھا۔ اسی سفر کے دوران میں غالب نے چراغ دیر تصنیف کی اور گل رعنا (فارسی واردو شاعری کا انتخاب) مرتب کیا۔ دہلی میں غالب نے فارسی میں بہت کم لکھا، سفر کلکتہ کے دوران میں انھوں نے فارسی میں زیادہ لکھا۔ مکاتیب اور شاعری دونوں۔ فارسی کو ذریعہ اظہار بنانے کا فیصلہ بھی بے حد اہم تھا۔ پنشن کے حوالے سے یہ سفر کچھ کامیاب نہیں ہوا، مگر تخلیقی حوالے سے اس کے ثمرات زیادہ تھے۔ شاید اسی لیے کلکتہ غالب کے یہاں رنج وراحت کے ان جذبات کی یاد بن گیا، جنھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہوتا ہے۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اس میں شک نہیں کہ غالب نے آئین اکبری کی تقریظ میں سرسید کو یورپ کی دخانی تہذیب کا احساس دلایا، مگر سوال یہ ہے کہ خود غالب اس تہذیب کی روح سے متاثر ہوئے تھے، اور کیا اس امر کی شہادت ان کی شاعری سے ملتی ہے؟ پہلے یوسف حسین خان کا اقتباس دیکھیے، جس میں غالب کی جدیدیت کو مغربی الاصل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میرے خیال میں اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں جب کہ دہلی والوں کو انگریزوں سے براہ راست واسطہ پڑا، غالب ان چند لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے انگریزی عمل داری اور اس کی کارگزاری کو خیر و برکت خیال کیا، اور مغربی تہذیب کے بنیادی اصول کا خیر مقدم کیا۔ یہ اصول انیسویں صدی کے شروع میں لبرل ازم کے ساتھ ہم آمیز تھے، جن کی تہ میں آزادی، انفرادیت، قانونی مساوات، انسان دوستی، رواداری اور علمی تنقید کی لہریں انسانی ذہن کو سیراب کر رہی تھیں۔ یہ سچ ہے کہ غالب کا خاندان اور وہ خود انگریزوں سے وابستہ تھے، لیکن ان کی یہ وابستگی افادی ہونے کے ساتھ ذہنی بھی تھی۔ غالب کی فراست نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ انگریزی عملداری جن انتظامی اور علمی اصولوں پر قائم ہے، وہ شاہی اور جاگیرداری نظام سے اعلا وارفع ہے ۲۱۔

یوسف حسین خان نے یہ تو درست کہا ہے کہ غالب کی انگریزی حکومت سے وابستگی افادی تھی، مگر یہ کہنا درست نہیں کہ ذہنی بھی تھی۔ انھوں نے غالب کی شعریات میں مغربی عناصر کی نشان دہی نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ دہلی میں ملک واقعی بادشاہ کا تھا اور حکم کمپنی بہادر کا۔ غالب کا دلی تعلق بادشاہ کے ملک دہلی سے تھا۔ دہلی میں انگریز ریزیڈنٹ ضرور موجود تھا؛ انگریزوں نے دہلی کالج بھی قائم کر دیا تھا جہاں انگریزی واردو میں نئے علوم کی تعلیم دی جا رہی تھی۔ قلعے کے معاملات میں کمپنی کا عمل دخل مسلسل بڑھ رہا تھا، اور غالب کا گزارہ کمپنی کی پنشن اور فرنچ وائن پر تھا، مگر اسی دہلی کی ثقافت، فن تعمیر، مدارس، مشاعرے، خانقاہیں وہی تھیں جن کی تعمیر مغل جمالیات سے ہوئی تھی۔ غالب نے انگریزوں کے نمک خوار ہونے کا ذکر جا بجا کیا ہے، ان کا ۱۸۵۷ء میں دفاع بھی کیا (جس کا تفصیلی جائزہ ہم لے چکے ہیں)، مگر انھوں نے پنشن کی جدوجہد کے بعد دوسری جدوجہد استاد شاہ بننے کے سلسلے میں کی۔ غالب کی شخصیت اور طرز زندگی اپنی اصل میں مغل اشراف کا تھا۔ غالب نے قیام دہلی میں انگریزی آئین کی تعریف نہیں کی۔ جب وہ کلکتہ پہنچے ہیں تو انھیں وہ شہر دہلی سے مختلف نظر

آیا۔ کلکتے ہی نے انھیں اس ثنویت سے مطلع کیا جو گورے اور کالے، کولونیل شہر اور ہندوستانی شہر، انگریزی تہذیب وآئین اور مغلیہ ہندوستانی تہذیب و آئین سے عبارت تھی۔ دہلی میں وہ متکاف برادران سے ملتے رہے، کلکتے کے سفر کے بعد ولیم فریزر نے انھیں دہلی کالج میں فارسی استاد بننے کی پیش کش بھی کی، مگر انھیں دہلی میں رہتے ہوئے یورپی تہذیب کا قصیدہ لکھنے کا خیال نہیں آیا۔ انھوں نے دہلی کا مرثیہ ضرور لکھا، جسے دخانی تہذیب والوں نے برباد کیا۔ کیا یہ غور طلب بات نہیں کہ اپنی مشہور تقریظ میں نئی دخانی تہذیب کی طرف سرسید کو متوجہ کرنے کے باوجود، خود اس کی طرف راغب نہیں ہوئے؟

دہلی میں بھی غالب کا واسطہ انگریزوں، ان کی تہذیب کے مظاہر، انگریزی اداروں (دہلی کالج) سے پڑتا رہا، ۱۸۵۷ء میں انھوں نے ان کی اسی طاقت کا بھیانک چہرہ بھی دیکھا، جس کی ستائش انھوں نے سفر کلکتہ میں کی تھی، مگر ان کی شاعری پر نئی یورپی تہذیب کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ جس شعریات کے حامل تھے، اس کی عظمت اور خود مختاریت کا کوئی نہ کوئی تصور ضرور رکھتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے یہاں ایک کمی، ایک خلا، ایک شگاف کا ضرور احساس پیدا ہوتا، جسے وہ اس جدیدیت سے باقاعدہ استفادے یا استفادے کی آرزو کی مدد سے پورا کرتے، جس کی نمائندگی دہلی کالج کررہا تھا۔ ایک اور بات بھی پیش نظر رکھنے کی ہے کہ عام طور پر نئے رجحانات، نئے نظریوں اور نئی تہذیبی روشوں کو سب سے پہلے اشرافیہ قبول کرتی ہے، اور غالب کا تعلق اسی اشرافیہ سے تھا۔ دستنبو میں انگریزوں کی تعریف کرنے کے باوجود اگر انھوں نے اپنی شاعری میں انگریزی اثر نہیں آنے دیا تو اس کا سبب اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ ان کی شعریات اس جدیدیت کے سلسلے میں خود کفیل ہونے کے یقین سے سرشار تھی، جس کی وکالت ان کے دوست اور شاگرد، ان کی زندگی ہی میں کرنے لگے تھے۔

نوآبادیاتی جدیدیت سے اردو شعرا کا تعلق دو جذبیت کا تھا؛ وہ اس کی طرف کھنچتے بھی تھے، اور اس سے بھاگتے بھی تھے۔ وہ ایک دبدھے میں گرفتار تھے۔ جب وہ نوآبادیاتی جدیدیت کی طرف لپکتے تھے تو ایک طرف اس کا نیاپن (جو یورپی علوم وٹیکنالوجی کے شکوہ کا تاثر بھی لیے ہوتا تھا) انھیں اپنی طرف کھینچتا تھا، اور دوسری طرف وہ خود اپنی مقامی دنیا و روایت سے بے دخل اور معزول ہوتا محسوس کرتے تھے۔ اگرچہ مقامی دنیا وروایت کے 'پس ماندہ، تاریک، قبل جدید' ہونے کا حاوی بیانیہ، انھیں وقتی طور پر اس سے بے دخل ہونے کا جواز فراہم کرتا تھا، مگر اس حاوی بیانیے کے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ وہ یادداشت کی گم شدگی کی بنیاد پر استوار تھا، اور گم شدہ یادداشت کے لوٹ آنے کا احتمال رہتا تھا۔ (خاص طور پر انیسویں صدی سے شروع ہونے والی احیا پسندی کی تحریکیں گم شدہ یادداشت کو واپس لانے کی محرک بن جاتی تھیں)۔ یادداشت کی واپسی ان کی ثقافتی بے دخلی کے تجربے کو ایک شدید نفسیاتی بحران میں تبدیل کردیتی تھی۔ ایسے میں وہ نوآبادیاتی جدیدیت سے گریز اختیار کرتے تھے، اور طوفان میں گھرے جہاز کے مسافروں کی طرح انھیں ایک محفوظ لنگر کی تلاش ہوتی تھی۔ یہ لنگر غالب نے فراہم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کا شاید ہی کوئی نقاد اور تخلیق کار ہو جس نے غالب کی جدیدیت کو نہ سراہا ہو!

حوالہ جات:


۱۔ یوسف حسین خاں، غالب اور آہنگ غالب، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۷۱ء (۱۹۶۸ء) ص ۵۳
۲۔ ایضاً، ص ۲۲
۳۔ ایضاً
۴۔ غالب، دستنبو (ترجمہ شریف حسین قاسمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۷۸
۵۔ پرسیول سپیئر، Twilight of Mughal، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی ۱۹۷۳ء، ص ۳۸
۶۔ مارگریٹ پرناؤ، The Delhi College، اوکسفرڈ، ص ۱
۷۔ مالک رام، قدیم دلی کالج، ص ۲۲
۸۔ مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۶
۹۔ ایضاً، ص ۲۸
۱۰۔ ایضاً، ص ۶۵
۱۱۔ طاہر مسعود، اردو صحافت انیسویں صدی میں، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۶۳۔۱۶۴
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۶۹
۱۳۔ خلیق انجم، غالب اور شاہانہ تیموریہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۲۰۰۹ء (۱۹۷۴ء) ص ۲۱
۱۴۔ ایضاً
۱۵۔ غالب، دستنبو، ص ۸۰
۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰۵
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۰۳
۱۸۔ ایضاً، ص ۸۳
۱۹۔ شمیم طارق، غالب اور ہماری تحریک آزادی، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی، ۲۰۰۷ء (۲۰۰۲ء) ص ۳۹
۲۰۔ ڈاکٹر خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ص ۷۵
۲۱۔ یوسف حسین خان، غالب اور آہنگ غالب، ص ۲۰۔۲۱


❖❖❖

# ایٹمی حملے کے بعد کا منظر

ڈاکٹر کوثر محمود/راولپنڈی

آجکل پاکستان اور ہندوستان کے درمیان بد اعتمادی عروج پر ہے اور مختلف حیلے بہانے سے جنگی جنون کو ہوا دی جارہی ہے۔ ذرائع ابلاغ پر کئی ''دانش ور'' اور سیاسی لیڈر جوشِ جذبات میں جوہری ہتھیاروں کو استعمال کی بات کرتے ہیں جیسے ایٹمی ہتھیار عام بندوق یا توپ کی طرح کوئی چیز ہوں۔ خاکم بدہن، جوہری جنگ کی صورت میں کیا ہوگا اس کے بارے میں ذرا بھی شعور نہیں پایا جاتا لیکن ان حالات میں ادیبوں شاعروں، اصحاب فکر و دانش کی خاموشی قبیح ترین جرم سمجھی جائے گی۔

سٹان فورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر پال ارلک (Prof. Paul Ehrlic) خبردار کرتے ہیں کہ (جوہری جنگ) میں جیتنے والا کوئی نہ بچے گا۔ ۱۰۰ میگا ٹن کے دھماکے (جو روسی اور امریکی جوہری اسلحے کا محض ایک فیصد ہے؛ پاکستان، ہندوستان کے جوہری اسلحے کے بارے میں کوئی اعدادوشمار دستیاب نہیں۔ اس وقت دنیا میں لگ بھگ ۳۰ ہزار ایٹمی بم موجود ہیں۔ موجودہ بموں کے دھماکے کی قوت ہیروشیما پر گرائے گئے بم سے دس لاکھ گنا زیادہ ہے) سے اتنا گردوغبار اُٹھے گا جو ۹۹% یا اس سے زیادہ سورج کی روشنی کو ہفتوں تک زمین پر پہنچنے سے روک دے گا۔

۱۹۵۴ء میں بکنی آٹول Bikni Atoll ، Pacific Ocean میں ایک جزیرے پر ایک تجرباتی بم گرایا گیا جس کی قوت ۱۵ لاکھ ٹن تھی۔ دھماکے کے ۹۶ گھنٹے کے بعد ہوا میں ۱۹۰ کلومیٹر تک ۳ ہزار ریڈ کی تابکار شعاعیں موجود تھیں اور ۳۶۰ کلومیٹر تک ۳۰۰ ریڈز کی پیائش کی گئی۔ یاد رہے کہ کوئی بھی انسان ۶۰۰ ریڈز کی شعاع کاری برداشت نہیں کر سکتا؛ تقریباً نصف لوگ ۴۵۰ ریڈز پر مرجاتے ہیں، ۵۰ سے ۱۰۰ ریڈز کی شعاعیں انسان کے مدافعتی نظام کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ تابکاری سے شدید متاثرہ شخص پہلے ہفتے میں متلی، قے، بخار، بے ہوشی، پیچش، گلے کی بندش وغیرہ کا شکار ہو جاتا ہے اور ایک دو ہفتے کے اندر مدافعتی نظام کے کمزور پڑنے اور پانی اور غذائی کمی کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔☆☆☆

اگر پانچ ہزار سے دس ہزار میگاٹن کا دھماکہ ہوا تو عالمی سطح پر بلیک آؤٹ ہو جائے گا کیونکہ گردوغبار کے بادل سورج کی شعاؤں کو زمین پر پہنچنے سے روک دیں گے۔ جب زیریں احمر (Infra red rays) شعاعیں زمین پر نہیں پہنچیں گی (جو زمین پر گرمی کا سبب بنتی ہیں) تو چند ہفتوں کے دوران جون جولائی کے مہینوں میں بھی درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے گر جائے گا۔

انسانوں کی اکثریت فوری طور پر ہلاک ہو جائے گی دور دراز کے رہنے والے انسان بھوک اور پیاس سے مرجائیں گے کیونکہ تمام دریا، ندیاں اور جھیلیں جم جائیں گی۔ کھڑی فصلیں جل جائیں گی اور شمالی علاقوں میں بچ جانے والی فصلیں درجۂ حرارت گرنے سے تباہ ہو جائیں گی کیونکہ روشنی کے نہ ہونے سے ضیائی تالیف (Photosynthesis) کا عمل پودوں میں شروع نہ ہو سکے گا۔ انسان اور جانور خوراک نہ ہونے کی وجہ سے فاقوں مر جائیں گے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پودے تو چلو پھر بھی امکان ہے کہ بیجوں سے دوبارہ نکل آئیں گے لیکن جانور اور انسان دوبارہ کیسے پیدا ہوں گے؟ اور اگر پانی تمام پائپوں میں جم جائے تو پانی کے حصول کے لئے دریا یا ندی تک پہنچنا کتنا دشوار ہوگا؟ کتنی پیاس ہوگی؟ ☆1

## ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی پر ایک نظر

دنیا نے پہلی مرتبہ ہولناک ایٹمی تباہ کاری کا مشاہدہ ۶ اگست، ۱۹۴۵ء کو جاپان کے شہروں، ہیروشیما اور ۹ اگست کو ناگاساکی میں کیا۔ ایک لاکھ چالیس ہزار لوگ ہیروشیما اور ۸۰ ہزار معصوم لوگ موت کے منہ میں چلے گئے؛ وہ لوگ کہ جو براہِ راست کسی جنگ میں شریک نہ تھے۔ تقریباً آدھے لوگ تو فوراً ہلاک ہو گئے باقی آدھے لوگ شدید زخموں، جلنے سے، تابکاری کے اثرات اور بھوک پیاس کی شدت سے مر گئے۔ زندہ بچ جانے والوں کی حالت مردوں سے بدتر تھی کیونکہ تمام ہسپتال تباہ ہو چکے تھے ۹۰% ڈاکٹر اور ۹۳% نرسیں بھی ہلاک ہو چکی تھیں۔ آپ اُس ماں کے دکھ اور کرب کو محسوس کریں جو خود بھی شدید زخمی ہے اور اپنے جلے ہوئے بچے کو ہاتھوں میں اُٹھا کر، بھوک اور پیاس سے بے حال، تباہ شدہ ہسپتال کے سامنے مرے ہوئے ڈاکٹروں کے درمیان کسی مسیحا کی منتظر ہے! اس کی مدد گیری کو کون آئے گا؟

ہیروشیما کی تباہی کے عینی شاہد، ٹوکیو یونیورسٹی میں ماڈرن فلاسفی کے پروفیسر، فادر جون اے سیمز بتاتے ہیں کہ ''ایک دم تیز پیلی روشنی کا جھماکہ ہوا جو میگنیشیم کی روشنی کی طرح تھی، ان کے سر اور ہاتھوں سے خون نکل رہا تھا، باہر نکلنے کے تمام

دروازے بند ہو چکے تھے۔زیادہ تر لوگ شیشے کے ٹکڑے لگنے سے زخمی ہوئے تھے،مائیں اپنے جلے ہوئے بچوں کو اُٹھا کر دیوانہ وار بھاگ رہی تھیں ....تمام کسانوں کے گھر جل رہے تھے....'' ☆1-a

ایک اور عینی شاہد، ایک گیارہ سالہ لڑکے،ہیساٹو ہیٹونے اپنی یادداشتوں میں لکھا؛

''۵ اگست کی صبح ہم لوگ اپنے بھائی سے ملنے ہیروشیما گئے جو وہاں ایک کالج میں پڑھتا تھا۔میرے بھائی نے ایک رات ہمارے ساتھ ہوٹل میں بسر کی۔۶ تاریخ کی صبح میری ماں (ہوٹل کے) دروازے کے پاس کھڑی تھی اور بل دینے سے پہلے ہوٹل کے مالک کے ساتھ بات کررہی تھی اور میں ایک بلی کے ساتھ کھیل رہا تھا تبھی نیلی سفید روشنی کا ایک جھماکہ دروازے میں سے اندر آ گیا۔کچھ دیر بعد مجھے ہوش آ گیا لیکن ہر طرف اندھیرا تھا۔ ہوٹل کی دو منزلیں گر چکی تھیں اور میں ایک دیوار کے ساتھ ملبے تلے دبا ہوا تھا۔اگرچہ میں نے رینگ کر نکلنا چاہا لیکن حرکت نہ کرسکا۔میں نے آنکھیں بند کرلیں اور سوچنے لگا کہ میں مر رہا ہوں۔تب میں نے سنا کہ میری ماں مجھے پکار رہی ہے۔اُس کی آواز پر میں نے آنکھ کھولی اور شعلوں کو اپنی طرف رینگتے پایا۔میں نے اپنی ماں کو آوازیں دیں۔میری ماں نے کچھ جلتے تختے کھینچے اور مجھے بچالیا۔ ہر شے اتنی بدل گئی تھی کہ میں دہشت زدہ ہوگیا۔جہاں تک نظر جاتی تھی ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔قریب سے گذرتے ہوئے لوگوں کی جلد سرخ تھی جیسے اوپر سے اتاری گئی ہو۔یہ لوگ چیخ رہے تھے؛باقی سب مر چکے تھے۔گلیوں میں پڑی لاشوں۔ تباہ شدہ گھروں اور کراہتے ہوئے زخمیوں کے باعث چلنا محال تھا۔پتہ نہیں چلتا تھا کہ کیا کریں۔میں نے مغرب کی طرف مڑا تو دیکھا کہ شعلے قریب تر آ رہے ہیں۔

پانی کے کنارے پہنچا تو لگا کہ میں اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہوں؛ جل جانے والے لوگ دریائے کیاشی میں چھلانگیں لگاتے اور پھر چیختے ہوئے باہر نکل آتے کہ پانی بھی گرم تھا۔اُن سے تیرا نہیں جارہا تھا اور وہ ڈوبتے ہوئے چلّا رہے تھے۔'' ☆1aa2

ہیروشیما کی دوتہائی عمارتیں مکمل طور پر تباہ ہو گئیں تھیں،سینکڑوں جگہوں پر آگ لگ گئی اور اس آگ نے پھیلتے پھیلتے چار میل تک ہر شے کو جلا کر رکھ دیا۔دس میل تک کھڑکیاں دروازے ٹوٹ گئے تھے اور اس دھماکے کے اثرات ۳۷ میل تک محسوس کیے گئے۔دھماکے کے آدھے گھنٹے بعد سیاہ رنگ کا تابکار مادہ آسمان سے گرنا شروع ہوگیا جس نے ہر شے کو زہریلا بنادیا۔

ریڈیو سٹیشن خاموش ہو گئے، ٹیلی گراف کی لائنیں جواب دے گئیں۔ہیروشیما میں کسی بڑی تباہی کی افواہیں پھیلنے لگیں؛قریبی ریلوے سٹیشنوں سے آمدہ پیغامات میں بتایا گیا کہ ہیروشیما میں کوئی بڑا دھماکہ ہوگیا ہے۔تقریباً ۶۸۱ کلومیٹر دور دارلحکومت ٹوکیو میں فوجی جنرل ہیڈکوارٹر نے مقامی فوجی کمانڈ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی وہاں مکمل سکوت تھا۔جاپانی اعلیٰ فوجی قیادت پریشان تھی کہ آخر ہوا کیا ہے کیونکہ ہیروشیما میں کوئی اسلحہ گولہ بارود کا بڑا ذخیرہ بھی نہیں تھا اور کسی بڑے فوجی حملے کی کوئی اطلاع بھی نہیں تھی۔

ایک جنرل سٹاف کے افسر کو حکم ملا کہ وہ فوراً ہیروشیما پہنچے۔جب اُس نوجوان افسر کا طیارہ ہیروشیما سے ۱۶۰ کلومیٹر دور تھا تو پائلٹ نے عین دوپہر میں گرد وغبار کے ایک بڑے بادل کو دیکھا۔تمام شہر جل رہا تھا۔شہر میں ہوائی جہاز کے اترنے کی کوئی جگہ نہ تھی سو اس نے شہر کے جنوب میں کسی قریبی ایئرپورٹ پر اُتر کر حکامِ بالا کو صورتِ احوال سے آگاہ کیا۔

ٹوکیو میں عجیب و غریب افواہیں پھیل رہی تھیں۔بم گرنے کے سولہ گھنٹے بعد امریکی صدر نے سرکاری طور پر اعلان کیا کہ ہم نے جاپان پر ایٹمی بم گرا دیا ہے اور اگر جاپان نے ہماری شرائط پر شکست تسلیم نہ کی تو اسے ایسے مزید حملوں کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ جن کی نظیر اس سے دنیا نے نہیں دیکھی ہوگی۔

جاپانیوں نے ایٹم بم کے توڑ کے لیے ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی بنائی جس کا پہلا اجلاس ۷ اگست کو ہوا۔جاپانیوں کو اب تک یقین نہیں تھا کہ امریکہ نے ایٹمی حملہ کیا ہے؛ بلکہ وہ ابھی تک باور ہی نہیں کررہے تھے کہ امریکہ نے اتنی صلاحیت حاصل کرلی ہے کہ وہ ایٹم بم کو جاپان تک پہنچا سکے،وہ اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ کوئی نئی قسم کا بم استعمال ہوا ہے۔اسی لیے جب جاپان نے سرکاری سطح پر اس حملے کا اعلان کیا اُس اعلان میں لفظ ایٹم شامل نہ تھا۔

نیوی کی ٹیموں نے جا کر تحقیق کی تو پتہ چلا کہ اس بم سے ہونے والی تباہی روایتی بموں کی تباہی سے مختلف تھی۔تمام شہر کھنڈر بن چکا تھا؛جن عمارات کا ڈھانچا سلامت بھی دکھائی دیتا تھا وہ اندر سے مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔قبرستانوں کا کوئی نام ونشان نہیں تھا تمام گرجا گھر مسمار ہو چکے تھے۔ ۹۰% ڈاکٹرز اور طبی عملہ یا تو مر چکا تھا یا معذور ہو چکے تھے۔دھماکے میں زخمی ہونے والوں کو ہیباکوشا hibakusha کا نام دیا گیا جس کا معنی تھا 'دھماکے سے متاثر ہونے والے'۔ان متاثرین میں قے اور دست اتنے عام تھے کہ ان کی ایک بڑی تعداد جسم میں پانی کی کمی (dehydration) کی وجہ سے ہلاک ہوگئی۔ان کے بال گر گئے تھے اور اُن کے

زخموں سے خون رس رہا تھا۔

ایک عینی شاہدؔ آ کی ہیرو تا کاہاشیؔ .Mr Akihiro Takahashi نے بتایا کہ وہ ۱۴ سال کا تھا اور جائے دھماکہ سے ڈیڑھ کلومیٹر دور سکول کی ایک قطار میں اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ کھڑا تھا کہ اچانک بے انتہا گرمی کی لہر آئی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا سارا بدن جل اُٹھا ہے۔ میں نے گھر کی طرف بھاگنا شروع کیا تو مجھے لگا کہ میرے پیر بُری طرح جل رہے ہیں؛ پاؤں کے تلووں سے جلا ہوا گوشت نظر آ رہا تھا، پھر میں کہنیوں اور گھٹنوں کے بل چل کر گھر پہنچا......مذکورہ لڑکا ڈیڑھ سال تک زیرِ علاج رہا اور آج بھی وہ زندہ ہے لیکن آج بھی اُس کے ہاتھوں کے ناخن سیاہ اُگتے ہیں۔☆1-b

کشمیر میں زلزلے کے دوران ہم نے دیکھا کہ دوست ممالک، ترکی فرانس اور دیگر مغربی ممالک کے ڈاکٹر، طبی عملہ اور دوائیں چار دنوں کے بعد پہنچیں؛ ایٹمی دھماکے کی صورت میں کوئی ہماری مدد کو نہیں آئے گا کیونکہ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کے باشعور عوام کو اپنی اپنی حکومتوں سے سوال کرنا چاہیے کہ انہوں نے اپنے عوام کا پیٹ کاٹ کر ایٹم بم تو بنالیا ہے لیکن ایٹمی حملے کی صورت میں اپنے عوام کے بچاؤ کا کیا انتظام کیا ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے بلکہ دونوں ملکوں کی حکومتوں نے اپنے عوام کو ممکنہ حفاظتی اقدامات کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔

خدانخواستہ جنگ یا کسی حادثے کی صورت میں (چرنوبل کی مثال ہمارے سامنے ہے) ہلاکتوں اور نقصانات کو کس طرح کم کیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں ہماری حکومتیں مکمل طور پر خاموش ہیں لیکن کینیڈا کی حکومت نے اپنے عوام کو خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے ایک پروگرام شروع کیا ہے، جس کے چیدہ چیدہ نکات یہ ہیں:

## ۵ میگاٹن ہائیڈروجن بم کا دھماکہ

ایک بڑے شہر کی مکمل تباہی کے لیے کافی ہے۔ اتنی قوت کا بم گرنے کی صورت میں روشنی کا تیز جھماکہ ہوگا اور بے انتہا حرارت خارج ہوگی اور دھماکے کی لہر سے تین میل تک تمام عمارات تباہ و برباد ہو جائیں گی اور ۲۰ میگاٹن دھماکے کی صورت میں یہ اثرات ہر طرف ۲۴ میل یا ۴۰ کلومیٹر تک جائیں گے۔ پہلے تیز روشنی کا جھماکہ ہوگا اور اگر یہ بم آپ سے ۱۰ میل کے فاصلے پر گرتا ہے تو آپ کے بچنے کے لیے صرف ۳۵ سیکنڈ ہوں گے۔ اڑتے ہوئے شیشے، کنکر، پتھر ہر طرف پندرہ میل تک لوگوں کو زخمی/ ہلاک کر سکتے ہیں۔ ہر شے جل رہی ہوگی، آگ کم از کم ۲۴ گھنٹے تک لگی رہے گی؛ فائر بریگیڈ کہاں سے آئے گا؛ وہ تو بیچارے پہلے ہی ہلاک ہو چکے ہوں گے کیونکہ اس وقت جتنے بھی آگ بجھانے والے سٹیشن ہیں وہ تمام شہروں کے اندر ہیں۔

## تابکاری Fall out کیا ہے؟

گرد و غبار کے بادلوں کے ساتھ تابکار مادہ ہوا میں بلند ہوگا اور باریک ریت کے ذرات کی مانند ہر طرف بکھر جائے گا اور جس طرف ہوا کا رُخ ہوگا یہ تابکارہ مادہ فال آؤٹ سینکڑوں میل دور جا سکتا ہے۔ (یاد رہے کہ ہیروشیما میں 'لٹل بوائے' نامی بم سے صرف ۲۲ کلوٹن کا دھماکہ ہوا تھا یعنی صرف ۲۲ ہزار ٹن کی قوت کا دھماکہ ہوا تھا اور اب کوئی بھی بم میگاٹن، یعنی لاکھوں ٹن سے کم کا نہیں ہے) ۵ میگاٹن کے دھماکے سے سات ہزار مربع میل کے علاقے میں تابکار مادہ (فال آؤٹ) گرے گا اگر یہ دھماکہ ایک ملک میں ہو تو دوسرا بھی یقیناً متاثر ہوگا۔ یعنی اگر خدانخواستہ لاہور پر ۵ میگاٹن کا بم گرتا ہے تو ہر طرف ۸۰ میل یا ۱۲۰ کلومیٹر تک یہ تابکار مادہ گرے گا جس سے پاکستان میں ضلع لاہور کے علاوہ گوجرانوالہ، گجرات، سیالکوٹ، نارووال، شکرگڑھ، شیخوپورہ، قصور، فیصل آباد اور اوکاڑہ متاثر ہوں گے دوسری طرف بھارت کے اضلاع امرتسر، گورداس پور، جموں توی، ترن تارن، فیروزپور، موگا، فرید کوٹ، مکسر اور کپورتھلہ کے اضلاع اس فال آؤٹ کے اثرات سے بچ نہیں پائیں گے۔

یاد رکھیے کہ جہاں بم گرے گا اُن بے چاروں کو تو سنبھلنے کا اور کسی حفاظتی تدبیر کو اختیار کرنے کا موقع تک نہیں ملے گا لیکن دھماکے کے مقام سے ۸۰-۸۵ میل دور رہنے والے اس تابکار مادے سے کیسے بچ سکتے ہیں؟

یہ فال آؤٹ دھماکے کے آدھے گھنٹے بعد شروع ہوگا یعنی تابکار گرد و غبار دھماکے کے آدھے گھنٹے بعد آسمان سے زمین کی طرف گرنا شروع ہوگا۔ یہ فال آؤٹ نظر نہیں آئے گا اس کی کوئی بُو نہیں ہوگی۔ یہ تابکار مادہ اگر انسانی جلد پر گرے گا تو جلد جل جائے گی۔ پانی میں گرے گا تو پانی زہر آلود ہو جائے گا یہ فال آؤٹ سانس کے ذریعے پھیپھڑوں میں جا کر انسانی جسم کے افعال کو متاثر کرتے ہوئے ایک مخصوص حالت Radiation Sickness یا تابکاری کی بیماری پیدا کرے گا۔ جس کی علامات یہ ہوں گی:۔

سر کے بال گر جائیں گے، بھوک ختم ہو جائے گی، رنگت زرد پڑ جائے گی، عمومی کمزوری اور اسہال شروع ہو جائے گا گلا خراب ہوگا اور مسوڑھوں سے خون آنا شروع ہو جائے گا۔ یہ تابکارہ مادہ گلے میں اہم غدود Thyroid Gland میں کینسر پیدا کر دے گا

جو بذاتِ خود ایک مہلک بیماری ہے۔تابکاری اُن بچوں میں بھی معذوری پیدا کرسکتی ہے کہ جو ابھی پیدا نہیں ہوئے۔

## فال آؤٹ سے بچاؤ کیسے ممکن ہے؟

کھلی فضا میں اس تابکار فال آؤٹ سے بچاؤ نا ممکن تاہم ۱۶ انچ اینٹوں کی دیوار (زیر زمین ترجیحی طور پر) ۳ فٹ پکی مٹی کی دیوار ۱۵ انچ سٹیل کی چادر یا ۱۳ انچ سیسے (Lead) کی موٹی چادر سے بنی حفاظتی پناہ گاہ میں اس فال آؤٹ سے بچا جاسکتا ہے۔یہ پناہ گاہ گھر کے اندر تہہ خانے یا بیسمنٹ میں بنائی جاسکتی ہے۔

یاد رکھیے کہ یہ فال آؤٹ تقریباً ۱۴ دن تک جاری رہے گا۔لہٰذا اُس پناہ گاہ میں کم از کم دو ہفتے کے لیے پانی، خوراک کا ذخیرہ از قسم خشک دودھ، کھجور، بسکٹ وغیرہ موجود ہونا چاہیے۔ابتدائی طبی امداد کی ضروری اشیاء اور درد کم کرنے والی دوائیں اور دوسری ضروری دواؤں کا بھی ذخیرہ رکھیں۔فضلے اور کوڑا کرکٹ کیلئے پلاسٹک کے تھیلے رکھیں۔

اس پناہ گاہ میں کوئی آگ پکڑنے والی شے مثلاً پیٹرول وغیرہ نہ رکھیں۔یاد رکھیں کہ ایٹمی دھماکے کی صورت میں تمام ذرائع مواصلات جواب دے جائیں گے لہٰذا بیرونی دنیا سے رابطہ صرف بیٹری سے چلنے والے ریڈیو کے ذریعے ممکن ہوگا۔لہٰذا ریڈیو اور سیل بھی اُسی پناہ گاہ میں موجود ہونا چاہیے۔موٹے کپڑے کمبل وغیرہ لازمی رکھیں۔

اگر یہ تابکار مادہ (فال آؤٹ) آپ پر گر جائے تو کیا کریں؟

اگر آپ محسوس کریں کہ فال آؤٹ کے ذرے آپ کے لباس پر پڑ گئے ہیں تو بیرونی کپڑے کوٹ قمیض وغیرہ پناہ گاہ سے باہر اتار کر اندر جائیں۔ان کپڑوں کو مت جھاڑیں۔ننگی جلد کو پانی سے اچھی طرح دھوئیں لیکن جلد کو ملنے یا رگڑنے سے اجتناب کریں کیونکہ اس سے یہ تابکار مادہ اور گہرائی تک چلا جائے گا۔

اگر خدانخواستہ کسی ایک شخص کو تابکاری کی بیماری (Radiation Sickness) ہو جائے تو دوسرے لوگ اطمینان رکھیں کہ یہ بیماری ایک شخص سے دوسرے کو منتقل نہیں ہوتی لیکن پانی اور خوراک کو اچھی طرح ڈھک کر رکھیں۔ان معلومات کو خود بھی اچھی طرح سمجھیں اور تمام گھر والوں کو بھی سمجھائیں۔

## پوٹاشیم آئیوڈائیڈ کی گولیاں

Tab KI 130 mg پوٹاشیم آئیوڈائڈ کی گولیوں کا ذخیرہ لازمی طور پر رکھیں کیونکہ آئیوڈین کی یہ گولیاں گلے کے غدود Thyroid Gland کو تابکار آئیوڈین Radio Iodine سے محفوظ رکھتی ہیں۔بُری خبر یہ ہے کہ آئیوڈین کی گولیوں کا موجودہ ذخیرہ ۲۴ گھنٹے میں ختم ہو جائے گا جبکہ یہ گولی روز کھانی ہوگی۔چرنوبل کے حادثے کے بعد امریکی حکومت نے آئیوڈین کی گولیوں کی تین لاکھ خوراکیں ہنگامی حالت میں ذخیرہ کر رکھی ہیں۔آپ اپنی حکومتوں اور وزارتِ صحت کے حکام سے پوچھیں کہ آیا انہوں نے اپنے عوام کے لیے مذکورہ دوائی کا مناسب ذخیرہ کر رکھا ہے؟ کیا وہ عوام کو دستیاب ہے؟ ہنگامی صورت میں مذکورہ دوائی کی عدم دستیابی کی صورت میں آئیوڈین ملا نمک ہی بچاؤ کا واحد ذریعہ ہے جس میں ۷۶.۵% آئیوڈین موجود ہوتی ہے۔

## حرفِ آخر

پاکستان اور ہندوستان کے سنجیدہ و فہمیدہ حلقوں سے دست بستہ التماس ہے کہ اپنے اپنے دائرہ اثر میں جنگی جنون کو بڑھنے سے روکیں جوہری دھماکے کی صورت میں تابکاری کے اثرات کا صحیح ادراک کریں کیونکہ زندگی قدرت کا انمول عطیہ ہے جو دوبارہ کسی صورت میں بھی نہیں ملتی۔

ہندوستان کے باسی تو شاید پھر تناسخ کے عقیدے کے تحت کسی دوسرے جنم کی توقع رکھتے ہوں لیکن مسلمانوں کو یہ زندگی پھر نہیں ملنے والی جب کہ اسلام کا تو مطلب ہی سلامتی ہے۔

**فاعتبروا یااولی الابصار**

حوالہ جات:

(خلائی سائنس اور پتھر کے زمانے کی سیاست، مصنف جون ایوری، ترجمہ محمد ارشد رازی، مشعل بکس، گارڈن ٹاؤن، لاہور، ایڈیشن ندارد، ۲۰۰۶ء، صفحہ ۱۱۷) ☆••

1. http://motherearth.com echological scene efter nuclear war-by Prof. Paul Ehrlic & Assoicates Dept. of Biological Sciences Stanford University. USA.

☆aa2 ۱۹۵۱ء میں یہ احوال لکھنے کے بعد یہ لڑکا تابکاری کی وجہ سے مر گیا اور اس کی ماں بھی چل بسی۔(خلائی سائنس اور پتھر کے زمانے کی سیاست، مصنف جون ایوری، ترجمہ محمد ارشد رازی، مشعل بکس، گارڈن ٹاؤن، لاہور، ایڈیشن ندارد، ۲۰۰۶ء، صفحہ ۹۸،۹۹)

کامیو، عقل یا جہنم۔ برٹش میڈیکل پروفیسر لاون۔آنے والی نسلوں کے مقدر کا فیصلہ کرنے والے ہم کون

# قمر رضا شہزاد کی ''خامشی'' کا دمدمہ

نازبٹ/لاہور

شاعری اور ادیان و مذاہب میری نظر میں دلیل پر موقوف نہیں ہوتے وہ ایک ایسے سچ پر بنیاد رکھتے ہیں جو انسان کے شعور سے لے کر دل کے جذبوں کی کاشت میں بے حد جاندار اور قابل لحاظ حصہ ڈالتے ہیں

شاعری اور دین و مذہب کے اصول و ارکان ہونے کے باوجود ان کی تعریف اور ان کی جنس کی ماہیت کارِ مشکل ہوتی ہے اور اگر کوئی کرنے کی کوشش بھی کرے تو پوری پیاس کے لئے ادھورے پیالے جیسا ہی چلن ہے

ایک بات تو طے ہے کہ شاعری بھلے انسانی معاملات اور رویوں کے مشک و عنبر سے صحن ذوق کو مہکاتی ہے پھر بھی تیقن اور تعین سے کہا جاسکتا ھے کہ کیفیت کے ساز و سامان کو درسی، تدریسی پیمانہ رائج میں نہیں تولا جاسکتا، شاعری اپنی اصل میں وہ پیالہ ہے کہ جب تک کوئی خود اس کو جرعہ جرعہ نہیں پیتا وہ کبھی بھی سرمستی اور مستی کو نہیں سمجھ سکتا

قمر صاحب کی غزلوں کا یہ چوتھا مجموعہ جو مجھے متکلم بنا رہا ہے پہلی نظر میں ہی اپنے سرورق کی معنی خیزی اور اپسرائیت میں قاری کو جکڑ لیتا ہے۔۔۔ بولتا ہوا سرورق!!

قمر رضا شہزاد کی شاعرانہ خامشی کو سنتے ہوئے میں گھنٹوں اسی کیفیتی مدار سے گزر رہی ہوں وہ شاعری جو لحہ بھر میں سکوت کا دریا ہوتی ہے اگلے ہی لحت وحشت پوش دشت میں ڈھل جاتی ہے

اب اس خامشی کو قابل تذکرہ و تبصرہ کس طرح کیا جائے؟ قمر رضا شہزاد صاحب کی خامشی نے میری الجھن دو چند کردی

"خامشی" میری نظر میں مظاہر فطرت کو موقع دیتی ہے کہ وہ سخن سرا ہوں اور اپنی ودیعتوں کو اظہار میں لائیں، جمالیاتی نقطہ نظر سے "خامشی" کی یہ بزم روز بجتی ہے۔۔۔ کائنات روز اسی طرح اپنے بام و در کھولتی ہے۔۔۔ انسان شناسی سے خُدا شناسی تک کی منزلیں طے کرتی ہے

قمر رضا شہزاد صاحب نے مظاہر فطرت کی یہ سخن آرائی اور اُن کے توسط سے اپنے دل، روح اور مکان وزماں پر اُترتی تنہائی اور خاموشی کو خود بھی مظاہر کی معیت میں سُنا۔۔۔ وہ خود اپنے مقابل آگئے۔۔ ایک متکلم آئنے کی طرح۔۔ سکوت کی شمع سے شعروں کی نغمگیں کرنیں اچھالتے ہوئے۔۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر قمر رضا شہزاد کے اندرون ذات تنہائی نہ ہوتی تو ان کو اس خامشی کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔۔۔!

قمر رضا شہزاد صاحب جس اعتماد سے کائنات کو اپنے رُوبرو کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور اس پر اپنے نقد ونظر کے تیر برساتے ہیں۔۔۔ بلا کے حساس مشاہدہ کار بن جاتے ہیں اور۔۔۔ ان کے مصاریع اور تلازموں میں ریاضت ہی ریاضت ہے تبھی تو ان کے اشعار کے تیر دل پر چوٹ کرتے ہیں۔۔۔۔ نظر کو جذب کرتے ہیں اور پھر دل کو بار دگر تعمیر کی دعوت دیتے ہیں

شاعری کے حوالے سے ہم جب بھی بات کریں تو بادی النظر میں ہمیں یہ بات ماننا پڑتی ہے اور اَظہر مِن الشمس بھی ہے کہ شاعر یا تو اپنی باطنی کیفیات سے سرشار ہوکر لکھتا ہے جسے ہم انفعالی کیفیت بھی کہتے ہیں یا جب خارجی واقعات و حادثات اس کے دِل پر اثر انداز ہوتے ہیں تب وہ شعر کہتا ہے یعنی ان دو کیفیتوں کے درمیان ہی شاعر اپنا نقطہ نظر بیان کرتا ہے

دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ شاعر اپنی اندرونی واردات کو کس جذب، کس گداز، کس رقت اور معنی کے کس ابلاغ کے ساتھ پیش کرتا ہے اور پیش کرتے سمے وہ اپنے منبرِ ذات کے اصل مقام پر بیٹھ کر اپنے دکھ درد اور کیفیات کو زبان دیتا ہے یا پھر پائیدان سے اُتر کر ایک مجذوبانہ سی چیخ و پکار کرتا ہے۔۔۔ ایک سلجھے ہوئے اور ناپختہ کار شاعر کے درمیان یہ ایک فرق ہے

قمر رضا شہزاد ایک انتہائی منجھے ہوئے، تجربہ کار اور کہنہ مشق شاعر ہیں ان کے ہاں ایسی تہذیب سخن اور تہذیب کلام پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی کیفیات بیان کرتے ہوئے اپنی ذات کی سچائی، اپنے لفظوں کے ہوش و خرد مند ہونے اور اپنے نفس مضمون کے استدلالی پن سے قاری کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔۔ شعر دیکھئے گا

پناہ مانگتا ہوں بے پناہ ہونے سے
مجھے نہیں ہے غرض بادشاہ ہونے سے

یہ فقیرانہ رنگ ہے۔ مثبت فقیرانہ رنگ! جس میں فقیر خُدا یا نا خُدا ہونے کا دعوٰی نہیں کرتا۔۔ اس شعر میں قمر صاحب نے اپنی حسیات کا مکمل مواخذہ کرتے ہوئے بے نیازانہ انداز میں ایک اخلاقی، خُدائی اور الٰہیاتی مضمون میں بے پناہ ہونے کے فلسفے کو اس مہارت اور خوبصورتی سے اُجاگر کیا کہ دو لفظوں کے استعمال سے قاری تک بے پناہ ہونے کے مصائب و نقصانات کی ترسیل کردی

مزاج کی اِسی فقیری کو وہ اس طرح بھی بیان کرتے ہیں

اسی لئے تو خود اپنا یہاں اسیر ہوں میں
یہ مُرشدوں کا زمانہ ہے اور فقیر ہوں میں

قمر رضا شہزاد کے ہاں کئی جگہ پر خُدائی

معاملات، الٰہیاتی معاملات اور کائنات کے ساتھ ہم کلام ہونے کے معاملات نظر آتے ہیں۔۔۔۔ ظاہر ہے کائنات کے ساتھ جب بندہ ہمکلام ہونے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا لب و لہجہ خطابیہ ہو جائے گا، اس کے اندر استدلالی پن آ جائے گا اس کے اندر رد و قبول کا ادراک پیدا ہو جائے گا۔۔۔۔ یہ تمام چیزیں مل کر ہی ایک لازوال تخلیق کو جنم دیتی ہیں جیسا کہ قمر رضا شہزاد کے اس شعر میں:

مشکل نہیں پھلانگنے کون و مکاں مگر
میں اپنے سامنے سے ابھی ہٹ نہیں رہا

اس شعر میں انسانی ذات کی وسعت۔۔۔۔ اپنی "میں" کی وسعت دیکھئے کہ کائنات کے کشف کرنے میں خود میرا اپنا وجود حائل ہے۔۔۔۔ میں اپنے سامنے اوٹ بن کے۔۔۔۔ سدِّ راہ بن کے کھڑا ہوں، حجابات کی دُنیا سے پردہ اٹھانے میں صرف میری ذات کی "میں" باقی ہے اور میں ابھی اپنی اس میں کو توڑ نہیں رہا۔۔۔ جس دن میں اپنے زمینی لب و لہجے میں آ گیا تو یہ کائنات میرے سامنے بکھری اور مکشوف حالت میں نظر آئے گی اور کہیں وہ اپنی ذات کی وسعت کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں

یہ ترے کون و مکاں ہیں مری وسعت سے بھی کم
اور ہوں آنکھ کی پُتلی میں سمایا ہوا میں
مُجھ میں بھری ہوئی ہے جہنم کی طرح آگ
بارُود ہوں مگر میں ابھی پھٹ نہیں رہا

اپنے اندر کی حرارت، اپنے اندر کے غضب اور اپنے اندر جلے ہوئے جی کی طرف اشارہ۔۔۔۔ شاعروں کی طینت ان کی جبلت میں یہ چیز اسی طرح موجود ہوتی ہے اور یہاں "جہنم کی طرح آگ کہہ کر انہوں نے اپنی شدت کیفیت اپنے غصے اپنے غضب کو اس سطح تک پہنچا دیا ہے کہ جس کے بعد کوئی دوسری مثال باقی نہیں رہتی۔۔۔۔ جہنم کی آگ سے بڑا عذاب اور کیا ہوگا؟ اس نارِ جہنم کو اپنے سینے میں بھر کے بھی خاموشی!!

یہ معاملہ ظرف کا بھی ہے اور بے بسی کا بھی۔۔۔ شاعر ایک متوازی خالق ہوتا ہے مصورِ ازل کے مقابلے میں وہ ایک متوازی مصور ہوتا ہے۔۔۔ اب اس شعر میں دیکھئے

اپنی پسند کا میں کوئی دوسرا جہاں
تیرے جہان جیسا بنا کر تو آؤں گا
میں اپنی موج میں آیا تو دیکھنا اِک روز
ترے جہان سے بہتر جہان ڈھونڈ لوں گا
میں تیری کائنات توڑ پھوڑ کر
جہان کوئی دوسرا بناؤں گا

اب یہاں ان اشعار میں قوتِ تخلیق دیکھ لیجئے۔۔۔۔ خُدا سے ہمکلامی اور قمر صاحب کا ڈبنگ لہجہ اور ان کا جارحانہ انداز دیکھ لیجئے کہ جیسے کوئی خُدا کی طرف دیکھ کر۔۔۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔۔۔۔ اور اگر یہ مُشکل بیانیہ ہے تو اسے یوں سمجھ لیں کہ "کیفیت" میں شاعر اور فقیر کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔۔۔۔ یہ تو ایک فقیرانہ سطح کا مجذوبانہ بیان ہے۔۔۔۔ کہ اس جہان میں سب میری پسند کا نہیں ابھی اسے اور مکمل کرنے کی ضرورت ہے میں اللہ کو بتا سکوں کہ میں خلیفۃ اللہ اتارا گیا تھا زمین پر۔۔۔۔ اس لئے اس جہان سے اچھا نہ سہی لیکن اک ایسا جہاں تو ضرور بناؤں گا۔۔۔۔ اقبال نے بھی کہا تھا نا

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دَما دَم صدائے کُن فیکُون

کہیں قمر صاحب اپنے جارحانہ انداز میں کہہ جاتے ہیں

کھینچ بھی سکتا تھا اس کون و مکاں کی رسی
ضِد میں آ کر جو ترے سامنے ڈٹ جاتا میں
کوئی بھی شے یہاں ترتیب میں نہیں مرے دوست
یہ کائنات بھی دراصل ہے فتور مرا!

قمر رضا شہزاد کی شاعری میں کائناتی تلازموں۔۔۔ کائناتی استخراج، کائنات کے ساتھ ٹکرانے یا پھر اسے اپنا دم ساز بنانے کا نظام شدت کے ساتھ موجود ہے

ماورائے عقل یا ایسی باتیں کہ عقل تحیر زدہ رہ جائے دراصل انکی طبیعت کی نُدرت ہے

میں کب کا چھوڑ آیا ہوں جنت مگر مرا
اب تک خُمارِ نان و نمک ٹوٹتا نہیں

یہ اس قدر خوبصورت شعر ہے کہ اس کی کرافٹنگ اور ڈرافٹنگ کے اندر گویا قمر رضا شہزاد نے اپنے فن شاعری کا سارا نچوڑ ڈال دیا ہو "خمارِ نان و نمک" لسانی و صوتی آہنگ اور معنویت کے حساب سے بھی بہت خوبصورت ترکیب ہے۔۔ نان و نمک شاعر کی خودی کا تذکرہ ہے اُس کے اندر کی بندش ہے جس کی کوئی انتہا نہیں

میں ایک بھٹکے ہوئے عشق کی لپیٹ میں ہوں
سو مُجھ پہ سُورہ ء یُوسف کا دَم کیا جائے

قمر رضا شہزاد کے ہاں تلمیحی نظام بھی بہت خوبصورت ہے۔۔۔ فکری و فنی عظمت لئے اس ایک شعر میں انہوں نے عشقِ حقیقی، عشقِ مجازی، نفس امارہ اور نفس مطمئنہ کے پورے فلسفے کو بیان کر دیا ہے۔۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ عشق نفس اَمارہ ہے، خواہش اور ہوس کی لپیٹ ہے جبھی تو اسے "بھٹکا ہوا عشق" گردانا، وہ جانتے ہیں کہ یہ عشق مستجاب نہیں ہے یعنی اللہ کے ہاں اسکی قبولیت نہیں ہے سو۔۔۔ سورہ ء یوسف کا دَم کیا جائے۔ اس ایک شعر میں حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کا پورا واقعہ سمٹا ہوا ہے۔۔۔ جب عشقِ الٰہی یا نفسِ مطمئنہ کو نفس امارہ بنانے کی کوشش کی گئی ذلیخا کی

طرف سے اور سب دروازے بند کردئے گئے جب حضرت یوسف علیہ السلام باہر کی طرف بھاگے تو ان کی قمیض پھاڑ دی گئی اس واقعہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا خُدا سے عشق منسوب کرنا اور کہنا

"میں اپنے آپ کو بری قرار نہیں دیتا نفس امارہ مجھے بُرائی کی طرف کھینچ رہا ہے میں اپنے رب سے پناہ مانگتا ہوں وہی بچاتا ہے جس پر اس کے رب کا رحم ہوجائے"

یہی عشق حقیقی ہے، یہی نفس مطمئنہ ہے جس کے اوپر کوئی غلبہ نہیں۔۔۔ لازوال شعر ہے اور مَن موہنے انداز میں تلمیح کو بیان کیا گیا۔۔۔ اسے تصوف کا شعر کہہ لیں۔۔۔ نفس کی تربیت کا شعر کہہ لیں اس ایک شعر میں قمر رضا شہزاد نے انسانی اخلاقیات کو ایک نقطے پر منتج کر کے قرانی دلیل سے اَمر کردیا

میں اپنے رَب سے مُلاقات کرنے والا ہوں
یہ کائنات مری راہ سے ہٹا مرے دوست
میں بھی پہنچ ہی جاتا خُدا تک، مگر مرے
رستے سے کائنات ہٹائی نہیں گئی

دراصل نفسانی اور مادی خواہشات اور کائنات ہی اللہ کی راہ میں ملنے میں حارج ہوتی ہیں۔۔۔ حائل ہوتی ہیں۔۔۔ انسان جب اس کائنات کی ہوس ذدہ رنگ و بُو سے نکل جائے تبھی وہ خدا سے ملاقات کرسکتا ہے۔۔۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو قمر رضا شہزاد کی شاعری پڑھتے ہوئے قران پاک کی بہت سی آیتیں یاد آجاتی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعوری یا لاشعوری طور پر قمر صاحب کی شاعری میں قران کا نُور اور نظامِ ہدایت کی خوشبو پائی جاتی ہے

لہو میں ہر گھڑی پھُنکارنے لگا ہے عشق
اٹھاؤ ہاتھ یہ مارِ سیاہ مارا جائے

اصل میں یہاں بھی وہی نفسِ امارہ ہے جو انسان کے خون میں مچل رہا ہے اور اسے بدی اور ہوس کی طرف کھینچ رہا ہے، یہاں بھی قمر صاحب نفس کی تربیت کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں کہ جب تک یہ سانپ یعنی نفسِ امارہ نہیں مرے گا برائی کی طرف دل راغب ہوتا رہے گا

مرنے کا خوف دل کی تہوں سے نکال کر
جینے کی آرزو ہے تو خنجر تلے سے آ
میرے خلاف کُھل کے بڑے حوصلے سے آ
اے یار تُو عقب سے نہیں، سامنے سے آ
وضو کیا ہے لہو سے تو پھر سرِ میداں
نماز اصل پڑھو عشق کو امام کرو

یہاں جوانمردی کے ساتھ قمر صاحب نے ان اشعار کو خدائی رنگ بھی دیا ہے، اخلاقی بھی اور انسان کو سماج میں جینے کا ہُنر بھی

ایک اصیل اور معتبر شاعر اپنے حِسی تجربات۔۔۔ اپنی محرومیوں، زندگی کی تلخیوں سے کشید کئے لمحات کی اذیت کو غزل کی نوک پر کھڑا کردیتا ہے اور وہ منافق بننے سے بچ جاتا ہے۔۔۔ قمر صاحب جب اپنی ذات کے سناٹوں کی طرف یا اُجڑی ہوئی وجودی بستیوں کا رُخ کرتے، تب ان جیسا غریب الوطن فنکار کوئی نظر نہیں آتا

ضرور ہے کسی بچے کی گور مجھ میں بھی
یونہی نہیں ہے یہ رونے کا شور مجھ میں بھی

اب اس سے زیادہ کیا اظہار ہو کرب و غم کی کیفیت کا!

ہم نے اک جنگ میں شکست کے بعد
عُمر بھر رقصِ فاتحانہ کیا

بادی النظر میں تو یہ صرف ایک پیراڈوکس ہے، شکست کے بعد رقصِ فاتحانہ کا کوئی جواز نہیں بنتا۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ شاعری ہے۔۔۔۔ شاعری وہ کام کرتی ہے جو عقل و خِرد میں نہیں آتی۔۔۔ اس لئے شاعری کی سوجھ بوجھ کے لئے عارفانہ مزاج بہت ضروری ہے۔۔۔ جب اپنے نفس کو شکست دے دی جائے تو انسان کی روح سرشار ہوجائے گی اور پھر رومی کی طرح عُمر بھر رقص فاتحانہ ہی ہوگا

میں ایک حوضِ خنک کی طرف روانہ ہوا
بھڑکتی آگ ترے درمیاں سے ہوتے ہوئے
مجھے خبر ہے خُدا میرے انتظار میں ہے
میں آرہا ہوں صفِ گُمرہاں سے ہوتے ہوئے

بھڑکتی آگ دنیاوی مشقت۔۔۔ خواہشوں کا مچلتا ہوا شعلہ۔۔۔ لکڑیوں کا ڈھیر۔۔۔۔۔ ایک پُل۔۔۔ جس کے درمیان سے ہوتے ہوئے گزرنا ہے

"خامشی" تو صرف ایک حوالہ ہے مجموعی طور پر اگر قمر رضا شہزاد کی شاعری کو دیکھیں تو اس کا ایک کثیر حصہ روحانیت، اِلٰہیات، تصوف اور اخلاقی تربیت پر مشتمل ہے، جس میں وہ اپنی روح کی طرف جسم اور نفس کے ساتھ جنگ و جدال میں برسرپیکار نظر آتے ہیں

یہاں ان اشعار میں حوضِ خنک ایک علامت ہے الٰہیات کے ساتھ وابستگی کی۔۔۔ تپتے بدن، نفسانی خواہشات ضروریات یعنی اس دنیا کو چھوڑ دینے کا اشارہ بھی۔۔

یہاں بھڑکتی آگ کو مقابلے کی چتاؤنی دیتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ میں ساری نفسانی خواہشات، اس دنیا کی سرمستی، دفن کرکے آگ پر مٹی ڈال چکا ہوں یعنی ترکِ دنیا کرچکا ہوں اور اب مجھے میری مُرادِ یقین سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔۔۔ کیونکہ خدا میرا منتظر ہے

مجھے یہاں حضرت علی رضی اللہ تعالٰی عنہہ کا فرمان یاد آگیا

"اللہ میں نے اس دنیا کو چھوڑ دیا، اے دنیا جا چلی جا، جا میں نے تجھے تین طلاقیں دیں جس کے بعد رجوع

کی گنجائش بھی نہیں، جامیں نے تجھے طلاق بائن دی"

قمر صاحب نے یہ وجد آور شعر کہا ہے حوضِ خنک کی ترکیب بھی بے مثال ہے اس سے جتنے بھی بڑے معنی نیکی اور حسنات کے لئے جائیں، کم ہیں۔۔۔آگ استعارہ یا کنایہ ھے بدی یا شیطان کا۔۔۔سو یہ شعر نیکی اور بدی کی جنگ ھے

میں اتنا نرم طبیعت کہ یہ بھی چاہتا ہوں
جو آستین میں رہتا ہے وہ بھی پَل جائے

شخصی حوالے سے بھی اگر دیکھا جائے تو قمر رضا شہزاد پاکیزہ ذہن و فکر کے مالک، بے لوث اور پُر خلوص انسان ہیں۔۔۔خود ستائشی اور خود نُمائی سے کوسوں دور۔۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ قمر رضا شہزاد بھی عجیب ہیں۔۔۔عجیب اس لحاظ سے کہ اس نفسا نفسی اور خود غرضی کے دور میں بھی نہ شہرت کی تمنا۔۔نہ نمود و نمائش کی ہوس۔۔۔۔نہ مادیت کی طلب۔۔۔سراپا دعا۔۔۔سراپا خیر۔۔۔۔کوئی بھی آئے اور دامن بھر کے خیر لے جائے

مرے لکھے ہوئے لفظوں کو رَد کریں صاحب
دُعا انہیں بھی جو مُجھ سے حسد کریں صاحب

قمر رضا شہزاد کی کائناتی، سیاسی، فکری اور سماجی شعور کی سطح عمیق اور گہری ہے۔۔۔۔ فصاحت و بلاغت، زبان و بیان پر عالمانہ قدرت۔۔۔۔آپکی شاعری میں اعتبارِ جاں اعتبارِ حرف و معنی میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔۔۔۔الفاظ اپنی تکریم کے ساتھ اُن پر منکشف ہوتے ہیں اور ترسیل کرتے ہیں

چند اشعار اور دیکھئے:

دن رات دیکھتا رہتا ہے مجھے عرش نشیں
اک تماشہ ہوں سرِ عرش لگایا ہوا میں

میرا ہونا اور نہ ہونا دونوں ایک سی صورت ہیں
میں تو وہ ہوں جس نے اپنا پہلے دن انکار کیا

سنائی جائے مجھے داستاں محبت کی
میں تھک چُکا ہوں مجھے تازہ دم کیا جائے

دونوں ہی اپنی سمت مجھے کھینچتے رہیں
دنیا و دیں کے درمیاں جھگڑا پڑا رہے

ہر طرف خامشی ہے میرے بعد
بولنے والا آخری میں تھا

اُگ آئے گا آخر میرا لشکر بھی
دھرتی میں روزانہ کچھ سَر بوتا ہوں

کسی سے جنگ ہوئی وہ بھی انتہا کی ہوئی
کسی سے عشق ہوا وہ بھی والہانہ ہوا

"خامشی" استعارہ ہے جبر اور ناانصافی کو سہنے کا۔۔۔۔ایسی خاموشی جو ہر طرح کے بے ہنگم شور پر حاوی ہے۔۔۔۔۔۔۔خامشی ایک طلسم کدہ

کتنی ہی جہتیں ہیں اس ایک خامشی کی۔۔۔کتنے مفاہیم پوشیدہ ہیں اس خامشی میں۔۔۔کتنا شور۔۔۔کتنا احتجاج اور کیسا طوفان برپا ہے اس خامشی کے پیچھے۔۔۔۔ خامشی اِک جہانِ معنی۔۔۔۔۔خامشی رُوحانیت، اِلٰہیات، تصوف اور تلمیحات کی جلوہ گری!!

مگر۔۔سب کچھ کہہ کر بھی۔۔۔ جب کچھ کہنے کی حسرت باقی رہ جائے تو قمر رضا شہزاد کی خامشی کے سَر ورق پر درج شعر ان کا بہترین ترجمان بن جاتا ھے

ہر طرف میری خامشی کا شور
اَن کہا ان سُنا کلام ہوں میں

مجھے نہ ماننے والے ضرور دیکھیں گے
کسی زمانہ ء آئندہ میں ظہور مرا

سچ پوچھیں تو ہم ایک ایسے منافق معاشرے میں سانس لے رہے ہیں جہاں کسی کے فن کو پرکھنے کا پیمانہ سچائی نہیں محض تعلقات ہیں گروہ بندیوں اور مخالفت برائے مخالفت کے تکلیف دہ سلسلے نے بہت سے جینوئن لکھنے والوں کو اپنی ذات میں محصور کر دیا ہے دل میں بھلے ہی کسی کی عظمتِ فن کے معترف کیوں نہ ہوں لیکن زبان پر لانے سے اس لئے بھی گریز کرتے ہیں کہ کہیں سامنے والے کا قد بڑا اور اپنا قد نہ چھوٹا ہو جائے، جبکہ اعترافِ فن ہی اصل عظمت ہے

ایک شاعر کا اپنے فن کے اوپر یقین ضروری ہے۔۔۔ایک شاعر جانتا ہے کہ اس کے فن کی قدر و قیمت کیا ہے غالب نے بھی اپنے زمانے میں بارہا اپنے اشعار میں یہ باور کرایا ہے کہ میں آنے والے زمانوں کا شاعر ہوں۔۔۔قمر رضا شہزاد کو ادراک ہے کہ شاید ابھی موجودہ زمانے میں ان کی شاعری کے محاسن مکمل طور پر لوگوں پر نہیں کھل سکے یا لوگوں کے ہاں وہ قوتِ سماعت، قوتِ مشاہدہ فہم و بصیرت یا قوتِ ادراک نہیں ہے جس سے ان کے فن کی رمزوں، اشارات اور گتھیوں کو مکمل طور پر سمجھا یا سلجھایا جا سکے اور وہ ان کے فنی ارتقاء پر بات کر سکیں۔۔۔۔۔۔۔قمر رضا شہزاد نے ایک سچے اور سُچے شاعر کی طرح برملا اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے اپنی شاعری میں کئی جگہ پر عندیہ دیا ہے کہ آنے والے زمانوں میں وہ پوری طرح ظہور و شہود میں آئیں گے اور ان کا فن بولے گا انہیں مکمل دیانتداری کے ساتھ سمجھا اور تسلیم کیا جائے گا جو کہ ان کا حق بھی ہے

یہ ایک شاعر کا یقین اور تیقن ہی ہے جو اس کو اس کے فن کے ساتھ مربوط رکھتا ہے اور وہ اپنے فن کو آنے والی نسلوں میں پھلتا پھُولتا دیکھتا ہے اور آئندہ بھی دیکھنا چاہتا ہے

میں اپنے بعد بھی دُنیا میں جگمگاتا رہوں
مرے چراغ کی لَو تا اَبد کریں صاحب!

# خالد مسعود کی شاعری

نوید مرزا/لاہور

اُردو کی کلاسیکی اور روایتی شاعری اب ناپید ہو کر رہ گئی ہے۔ جدید سے جدید تر ہونے کی کوشش میں بہت سے شعرا، شاعری کے مروجہ اصولوں کے خلاف چلنے میں کوشاں و مصروف دکھائی دیتے ہیں اور اسی کو اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ آج کی شاعری معنویت، سادگی اور بے ساختگی کی بجائے تجربات کی بھینٹ چڑھتی جا رہی ہے۔ ایسے میں سینئر شاعر جناب خالد مسعود کے دو شعری مجموعوں ''رعنائی'' اور ''بے ساختگی'' کی اشاعت اچھی شاعری پڑھنے والوں کے لیے کسی تحفے سے کم نہیں۔ یقیناً کتاب دوستی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے تحفہ خاص ہی ہے۔ بقول منو بھائی، خالد مسعود کی کچھ غزلیں میں نے پڑھی ہیں۔ اس نے غزل کے روایتی اسلوب میں اچھے شعر کہے ہیں۔ اسے شاعری میں شائستہ اور شگفتہ اظہار کا سلیقہ آتا ہے۔ زندگی سے متعلق اس کا تجربہ اور مشاہدہ گہرا ہے۔

زندگی کے بارے میں خالد مسعود کا تجربہ اور مشاہدہ ان کے شعروں میں جا بجا ملتا ہے۔ کلام میں سادگی اور روانی کا عنصر پڑھنے والوں کو متاثر کرتا ہے۔ خالد مسعود بنیادی طور پر محبت کے شاعر ہیں۔ مگر ان کے ہاں عصری مسائل کے حوالے سے کئی اشعار ملتے ہیں۔ محبت کے حوالے سے ان کی غزل میں روایتی چاشنی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے اندر محبت کی خوشبو پوری توانائی کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ وہ وصال و ہجر کے لمحوں کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ ان مختلف حوالوں سے ان کے چند اشعار پڑھیں:

دبی دبی سی یہ آشفتگی قیامت ہے
کسی کے ساتھ مری دل لگی قیامت ہے

..............

نہیں ہے شکوہ کسی کی بھی سرد مہری کا
تری طرف سے یہ بیگانگی قیامت ہے

..............

اس کا اک اک شعر تیرے نام ہے
میں نے بھی لکھا ہے دیوانِ غزل

..............

حیا کے رنگ سے کرتے ہیں دل کو بے قرار اکثر
وہ اپنے ناز سے اِترا کے دل پہ وار کرتے ہیں

خالد مسعود کے ہاں عصری مسائل کے حوالے سے بھی کئی اشعار موجود ہیں۔ چند شعر دیکھیں:

کیسی ویرانیاں ہوئیں ہر سُو
خفتِ ذات ہو گئی ہوگی

..............

چھایا سناٹا بزمِ انساں میں
ظلم کی بات ہو گئی ہوگی

..............

اس گردشِ دوراں نے مہلت نہ ہمیں دی کچھ
فرصت جو ملی ہوتی دامن کو سیا ہوتا

..............

غربت کے جو مارے ہیں دکھ ان کا بھی کم ہوتا
مسعود کسی نے تو یہ کام کیا ہوتا

خالد مسعود اپنی شاعری میں ایک حساس طبقے کے فرد دکھائی دیتے ہیں۔ جو سایہ دار درختوں کے کٹنے پر بھی تڑپ اُٹھتے ہیں۔ اس لیے فرماتے ہیں:

شہر کی ہو رہی ہے کیا توسیع
کٹ رہے ہیں ہرے بھرے اشجار

..............

حکمرانو خدا کا خوف کرو
دیکھ لو کتنے ہیں یہ سایہ دار

خالد مسعود کی شاعری میں کئی جگہوں پر ان کا صوفیانہ طرزِ احساس بھی واضح دکھائی دیتا ہے۔ وہ زندگی کو ایک درویش کی نظر سے دیکھنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نیازی ان کے اس وصف کے بارے میں اس طرح اظہار کرتے ہیں:

خالد مسعود ایک درویش اور صوفی ہے اس کا باطن اس کی شاعری میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے اندر کی سچائی نے اس کے جہانِ شعر کو معطر کر رکھا ہے۔ خالد مسعود کے پیغام میں ایک درویش کی نظر جتنا کمال ہے۔

اس کمال کو خالد مسعود کچھ اس طرح شعری روپ دیتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیں:

اہلِ دنیا جتنے ہیں وہ نفس کے ہیں تابع
اہلِ دل فقیری کو اختیار کرتے ہیں

..............

بندگی شانِ بندگی بن کر
مظہرِ ذات ہو گئی ہوگی

..............

اہلِ دل کا شیوہ تو دوستو فقیری ہے
فقر پر ہی وہ اپنی جاں نثار کرتے ہیں

مجھے یقین ہے کہ ''بے ساختگی'' اور ''رعنائی'' کے حوالے سے خالد مسعود کا نام ادبی دنیا میں زندہ رہے گا اور ان کی شاعری کو بھرپور پذیرائی ملے گی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ آمین

# اعظم سہیل ہارون کا گلشنِ تخیل اور ''نور کا جلوہ''

عبیداللہ نزاکت/حاصل پور

مشقِ سخن اور فنِ شعر گوئی پر دسترس اپنی جگہ ایک مسلم حقیقت ہے لیکن نعت کا شعر کہنے کے لیے بہر حال ایک وجدانی کیفیت، جذب و مستی، وارفتگی اور دل بستگی بہت ضروری ہے۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ نعت کا شعر شاعر از خود نہیں کہتا بلکہ اس سے کہلوایا جاتا ہے اور قابلِ رشک ہے اعظم سہیل ہارون کہ اس سے تو پوری کتاب ہی لکھوا دی گئی۔

کتاب ''نور کا جلوہ'' ایک ایسا آئینہ ہے جس سے اعظم سہیل ہارون کی کیفیتِ وجد منعکس ہوتی ہے۔ اس کی نعت پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ آقا ﷺ کا در اقدس ہی انسانیت کے لیے سامانِ راحت اور منزل ہے۔ اسی در سے دنیا جہان کی نعمتیں نصیب ہوتی ہیں ۔ اعظم کے دل میں بھی اُس دَر پہ حاضر ہونے کی حسرتیں مچلتی دکھائی دیتی ہیں۔ اپنی نعتوں میں وہ جا بجا اپنی ان حسرتوں کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار

آقا ﷺ کے دَر پہ دیکھو کہ کتنی ہیں نعمتیں
جو بھی وہاں گیا اُسے ملتی ہیں منزلیں
ہو گی کبھی تو میری بھی روضے پہ حاضری
دیکھوں گا اپنی آنکھوں سے روضہ کی عظمتیں

اعظم کی نعتیں درحقیقت اُس کے معمولاتِ زندگی کا پتا دیتی ہیں اور قابلِ رشک بات یہ ہے کہ اُس کے معمولات میں یادِ نبی ﷺ اور ذکرِ نبی ﷺ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ حضور ﷺ کی مدحت ہی میں اپنے شب و روز گزارتا اور اپنی سانسیں نکھارتا ہے۔ اُس کے اشعار میں پائی جانے والی وارفتگی ملاحظہ ہو۔

اُن کی مدحت میں ہی وقت اپنا گزارا جائے
یادِ سرکار ﷺ میں ہر سانس نکھارا جائے
ہر گھڑی یاد مدینے کی مجھے آتی ہے
بھیگتا پلکوں کا ہر وقت کنارا جائے

اعظم کی نعت گوئی جو اگر تکنیک کے حوالے سے دیکھا جائے تو سب سے اہم چیز اُن کی زبان ہے۔ اُس نے اپنے ہم عصروں اور سینئرز کو متاثر کرنے کے لیے الفاظ کی بندشوں اور لفظی مرصع سازی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ اپنے مطمعِ نظر کو نہایت سادگی اور سلاست سے بیان کیا ہے۔ میری رائے کے مطابق اُن کی نعتیں سہلِ ممتنع کا خوب صورت نمونہ ہیں۔ علاوہ ازیں انتہائی خوب صورت اور دل کش تشبیہات اور استعارات کے استعمال نے اعظم کی نعتوں کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس حوالے سے اُس کے اشعار دیکھیے۔

پھول مہکیں گے پھر عقیدت کے
پاک دل کی زمیں ہو جائے

..................

روشن رخِ رسول ﷺ سے سب ہو گئے چراغ
دل سب کے جگمگائے ہیں نعتِ رسول ﷺ نے

..................

دل میں ہے اُن کے حُسنِ عقیدت کی رنگ و بُو
جیسے کھلا ہُوا کوئی غنچہ گلاب کا

اعظم سہیل ہارون نے جس عقیدت مندی، سرشاری اور وفورِ عشق سے نعت کے اشعار کہے ہیں اُس نے اپنی زمینِ دل کو آباد کر لیا ہے۔ ''نور کا جلوہ'' بلاشبہ اُردو کی نعتیہ روایت میں ایک نہایت دل آویز اضافہ ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ اُس کے گلشنِ تخیل میں ہمیشہ نعتوں کے گلاب کھلتے رہیں اور خوشبو بکھیرتے رہیں۔۔(آمین)

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ اٹھارہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: 24-j ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

# میرا ملتان

بابا محمد اسحاق سہوتہ/ لاہور

ایک زمانہ تھا ذرائع خبر رسانی مفقود یا انتہائی سست رفتار تھے۔ لوگوں کے معاملات لوگوں تک زندگی بھر نہ پہنچ پاتے۔ عارضہ قلب سے جان ہارنے والے پارسا ٹھہرتے۔ کہا جاتا اللہ لوک تھا۔ سوتے سوتے اللہ کو پیارا ہوگیا۔ یہ ان دنوں کی باتیں ہیں جب چاند حُسن و جمال کی علامت تھا۔ کسے مجال ہوتی جو چاند میں داغ تک کا تذکرہ کرتا۔ بہنیں اپنے بھائیوں کو چندا ماموں کہہ کر بچوں سے متعارف کراتیں اور ڈھیر ساری خوشیاں سمیٹ لیتیں۔ سندیسے ادھر سے اُدھر پہنچانا کبوتروں کا کاروبار تھا۔ کبوتر کے احترام کا عالم کچھ یوں کہ شہزادیاں ادب سے مخاطب ہوتیں۔ گڑگڑا کر حکم صادر کرتیں۔

واسطہ ای رب دا تو جاویں وے کبوترا
چٹھی میرے ڈھول نوں پہنچاویں وے کبوترا

اب ''مائیکروسافٹ'' کی تولید نے اُلٹی گنگا بہا ڈالی ہے۔ جس نے جگ بھر کو پہلے اپنا دیوانہ بنایا پھر دنیا سکیڑ کر رکھ دی۔ گویا کرہ ارض ہی فتح کرلیا۔ اس کی آنا فانا فتوحات نے قدریں بھی ہڑپ کرلیں۔ کل ہی کا ماجرا ہے نور جہاں نہر والے پل پر ''ماہی خورے کتھے رہ گیا'' کی دہائیاں دیتی تھی آخری دنوں On line بلانے لگی۔ حتیٰ کہ نگوڑی بھاگو مسلّن بھی اب اپنے تنور کا email ایڈریس بانٹا کرتی ہے۔

مگر ملتان؟ یقین نہیں آتا اتنے بڑے شہر میں ایک بھی چڑیا گھر نہیں۔ عجائب گھر کس مخلوق کا نام ہے؟ نہیں جانتے۔ گرلز کالج شہری ضرورت پوری نہیں کرتے۔ زرعی یونیورسٹی کا جھنجھٹ پالا نہیں گیا۔ ذیلی نوعیت کے ایک کالج نما شے پر اکتفا، معراج پالی ہو جیسے۔ ٹیکنالوجی و سائنس یونیورسٹی کی ہمیں چنداں ضرورت نہیں۔ ایک سرسبز و شاداب اور خوشیاں تقسیم کرنے والی نہر پورے شہر کا احاطہ کیا کرتی تھی ناس ہو ''کوتاہ اندیش حکمرانوں کا'' اکلوتی نہر کو کھا گئے۔ ملتان کے ماتھے سے جھومر اُتار ڈالا محض ایندھن شکم کی خاطر۔

نیشنل پارک تو درکنار شہر میں کوئی ڈھنگ کا پارک تک نہیں۔ 40-30 لاکھ انسانوں کو مرغیوں کے ڈربوں میں بند کر رکھا ہے۔ چھوٹے بڑے سبھی معاشی بدحالی اور تفریحی محرومی کے باعث احساس مایوسی و احساس محرومی کا شکار ہیں۔ سکون آور گولیاں دھڑا دھڑ بک رہی ہیں۔ لگتا ہے گھٹن کی بنا پر مخلوق پاگل ہوئی کہ ہوئی۔ ہزاروں مربع میل علاقے کے لیے ایک ہی نشتر کالج و ہسپتال۔ ایسے عالم میں ترقی کا خواب بھی دیکھنا جرمِ سنگین کے مترادف۔ بے حسی اور خودغرضی بامِ عروج پر چڑھے بتیسی نکال رہی ہے۔ محبتیں اُجڑ چکیں۔ چہروں پر مردنی، آنکھوں میں بیگانگی، اپنے ہی سایہ کا خوف، دوائی جعلی، خوراک نمبر 2، کھاد نقلی، خالص تو بقول شخصے زہر بھی نہیں رہا۔ ماشیتے لیڈران کے ہاضمے اللہ جانے کس دھات کی پیداوار ہیں ں۔ بنک ہضم، شوگر ملیں ڈکار گئے۔ گھر گھر کی کہانی، قومی خزانہ سے زیادہ قدآور۔

ان کی خواہشات لامحدود اور داستانیں بھیانک، عالم پستی اس قدر خوفناک کہ حرص کے ہاتھوں اپنے بچوں کا صحت مند مستقبل، چھنوانے کے درپے، یہ نہیں دیکھتے، بڑے بڑے فرعونوں، زاروں، سلطانوں اور بادشاہوں کی اولاد گمنامی کی اتھاہ گہرائیوں کے سپرد ہوگئیں۔ آج کس بادشاہ کی اولادیں، کس قدر اور کہاں، کس روپ میں ذلت آمیز سانسیں گن رہی ہیں۔ بتائے کوئی، اگر وہ مطلق العنانیت کے دعویدار اپنی آئندہ نسلوں کے لیے راحتیں محفوظ نہیں کر سکے تو دورِ حاضرہ کے بونے آمروں، حاکموں، سیاست دانوں، بددیانتوں کے پاس کون سی مافوق الفطرت قوت و طاقت ہے، جس کے بل بوتے باور کرتے ہیں کہ کل کلاں انہی کی اولادیں، انہی کی نمبر 2 دوائیوں اور رزقِ حرام کی بھینٹ نہیں چڑھیں گی اور ان کی نسلوں کو کوئی غم نہیں ہوگا۔ یہ محض 8/1- نسلوں کا کھیل ہے۔ اس کے بعد مکافات عمل ہوگا اور ان کی نسلیں۔

کاش یہ جان لیں، ننگے جسم آنے والا، ساری دنیا لوٹ کر بھی منافع میں ایک کفن ہی لے کر جاتا ہے اہل ملتان بھی خبردار رہیں، سیدھی اُنگلی گھی نہیں نکلا کرتا۔ کسی مسیحا نے کبھی بھی ہلا کر، جگا کر، اُٹھا کر آپ کی جھولی میں حقوق نہیں ڈالنے، روئے بغیر تو ماں بھی شیرخوار کو دودھ نہیں پلاتی۔

نہ گفتگو سے نہ وہ شاعری سے جائے گا
عصا اُٹھاؤ کہ فرعون اسی سے جائے گا

✦✦✦

# علامہ اقبالؒ اور جاپان

عامر بن علی/ جاپان

پاکستان کا وجود علامہ اقبال کی دور اندیشی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اس فلسفی شاعر اور درویش سیاست دان کی مستقبل شناسی کا ایک دلچسپ حوالہ جاپان کے متعلق ہے۔ 1906ء میں تحریر کردہ اپنے مضمون ''قومی زندگی'' میں علامہ اقبال نے جاپان کو ایشیا کے اُبھرتے ہوئے ستارے سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ جاپان کے تین بڑے شہروں کی یونیورسٹیوں، ٹوکیو یونیورسٹی، اوساکا یونیورسٹی اور دائتوبنکا یونیورسٹی میں شعبہ اردو موجود ہے اور جاپانی طلباء کی اچھی خاصی تعداد اردو زبان کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ ان تینوں یونیورسٹیوں میں اقبالیات پر بہت سارا کام ہو چکا ہے۔ تینوں یونیورسٹیوں میں شعبہ اُردو کے انچارج اردو زبان پر مکمل دسترس رکھتے ہیں اور علامہ اقبال کی تمام اردو شاعری کا جاپانی زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں اور گاہے گاہے یہاں اقبال ڈے کا بھی اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ اُردو زبان جاپان میں نہ تو اجنبی ہے اور نہ ہی نئی ہے بلکہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مضمون ''جاپان میں اردو'' کے مطابق یہاں اردو کی تاریخ 1796ء میں اردو کی ایک لغت کی تیاری سے شروع ہوئی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری برس ہا برس اوساکا یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے رہے ہیں۔ آج کل ڈاکٹر انوار احمد ان کی جگہ یہ ذمہ داری نبھا رہے تھے جو حال ہی میں پاکستان واپس لوٹے ہیں اور وہاں مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین متعین ہو گئے ہیں۔ جاپان میں اقبالیات کے حوالے سے ایک اہم نام کاگایا صاحب کا ہے جنہوں نے بارہا جاپان میں اقبال ڈے کا اہتمام کرنے کے علاوہ 1989ء میں سپین کے شہر قرطبہ میں منعقد ہونے والے اقبالیات کے جلسے میں شرکت کر کے ''علامہ اقبال کے افکار'' کے موضوع پر مضمون پڑھا۔ اس جلسے کی تاریخی اہمیت علامہ اقبال کی اس شہر کے ساتھ وابستگی اور قرطبہ کی مسجد کے متعلق نظم کی وجہ سے بھی ہے۔ 1904ء میں شاعر مشرق نے جاپان کے متعلق ایک مضمون تحریر کیا جسے پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے بالکل تازہ ہے اور گمان بھی نہیں گزرتا کہ اسے ضبط تحریر میں آئے ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس مضمون کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''جاپانیوں کو دیکھو! کس حیرت انگیز سرعت سے ترقی کر رہے ہیں۔ ابھی تیس چالیس سال کی بات ہے کہ یہ قوم قریباً مردہ تھی۔ 36 سال کے قلیل عرصے میں مشرق اقصیٰ کی اس مستعد قوم نے، جو مذہبی لحاظ سے ہندوستان کی شاگرد تھی، دنیوی اعتبار سے ممالک مغرب کی تقلید کی اور ترقی کر کے وہ جوہر دکھائے کہ آج دنیا کی سب سے بڑی مہذب اقوام میں شمار ہوتی ہے اور محققین مغرب اس کی رفتار ترقی کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں۔ جاپانیوں کی باریک بین نظر نے اس عظیم الشان انقلاب کی حقیقت کو دیکھ لیا اور وہ راہ اختیار کی جو ان کی قومی بقا کے لیے ضروری تھی۔ افراد کے دل و دماغ دفعتاً بدل گئے اور تعلیم و اصلاح تمدن نے پوری قوم کو اور اس سے کچھ اور بنا دیا اور چونکہ ایشیا کی قوموں میں سے جاپان نے رموز حیات کو سب سے زیادہ سمجھا ہے، اس واسطے یہ ملک دنیوی اعتبار سے ہمارے لیے سب سے اچھا نمونہ ہے۔ ہمیں لازم ہے کہ اس قوم کے فوری تغیر کے اسباب پر غور کریں اور جہاں تک ہمارے ملکی حالات کی رو سے ممکن و مناسب ہو اس جزیرے کی تقلید سے فائدہ اُٹھائیں۔''

علامہ اقبال کے جاپان کے بارے میں تاثرات پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آج کل کے حالات کے متعلق ہی بات کی جا رہی ہے۔ حالانکہ اس تحریر کے بعد جو ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر رہا ہے اس دوران جاپانی قوم نے نہ جانے کتنے انقلابات دیکھے ہیں۔ 1915ء میں روس کے ساتھ جنگ جس میں جاپان کو فتح حاصل ہوئی اور پھر دو عظیم جنگیں دوسری جنگ عظیم میں اسے امریکہ کے ہاتھوں شکست ہوئی بلکہ ایٹمی بمباری کا سامنا بھی کرنا پڑا اور پھر بادشاہت کی جگہ برطانوی طرز کا پارلیمانی نظام آ گیا۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد ایک طویل عرصہ تعمیر نو کے عمل سے گزرنا پڑا لیکن اس قوم نے اقبالؒ کے اس نظریے کو بھی سچ کر دکھایا کہ ''افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر'' میرے لیے ایک دلچسپ انکشاف حکیم الامت کی شاعری میں جاپان کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ اشعار انھوں نے اس وقت کے مشترکہ ہندوستان کی صنعتی زبوں حالی کے تناظر میں کہے تھے لیکن ہمارے موضوع سے مطابقت رکھتے ہیں:

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسال کابل سے کفن جاپان سے

علامہ اقبال کے انتقال کی خبر یہاں کے پہلے

جاپانی اردو دان پروفیسر گاموں نے تحریر کی تھی جو کہ جاپان میں علامہ کی شخصیت کے متعلق پہلے نوٹ کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ اگست 1938ء میں یہاں ایک رسالے میں شائع ہونے والے اس تعزیتی نوٹ کی ایک تاریخی اہمیت ہے جس کے سبب میں اس کا اردو ترجمہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔ پروفیسر گاموں نے اس تعزیتی نوٹ کا عنوان ''ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کا انتقال'' تحریر کیا تھا جس کی تفصیل میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''ہندوستان کے مسلمانوں میں سب سے عظیم شخص جو نہ صرف فلسفی کے طور پر مشہور ہے بلکہ شاعر کے طور پر بھی۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے گزشتہ 21 اپریل کو صوبہ پنجاب کے لاہور شہر میں اپنی شاندار زندگی کو پورا کر لیا۔ ان کے انتقال کی خبر سے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ باشعور ہندوؤں کو بھی شدید دکھ ہوا تھا۔ محمد اقبال جرمنی اور انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے والے اور مشرق و مغرب کی روح کو اپنانے والے ایک عظیم پڑھے لکھے شخص تھے۔ وہ پین اسلام ازم کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک محب وطن شاعر بھی تھے اور ایرانی زبان میں سارے مسلمانوں کی روح کے ترجمان بن کر انہوں نے کئی تصانیف لکھی ہیں۔ ان کی اہم تصانیف کے عنوانات یہ ہیں ''بانگِ درا''، ''اسرارِ خودی''، ''رموزِ بے خودی''، ''بالِ جبریل''، ''پیامِ مشرق'' "Six Lectures on the Reconstruction of Religious thought in Islam." وغیرہ شامل ہیں۔ اب ''پیامِ مشرق'' میں سے چند اشعار پیش کر کے ان کے انتقال کے موقع پر غم کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کے بعد اقبال کے چند اشعار کا جاپانی زبان میں ترجمہ تحریر کیا گیا ہے۔ جاپان میں اُردو کی آبیاری میں جن لوگوں نے بنیادی اور اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں پروفیسر گاموسر فہرست ہیں جو عمر کا بیشتر حصہ ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ ''قصہ چہار درویش'' جیسی اردو کتابوں کے جاپانی زبان میں تراجم بھی کرتے رہے۔

مولانا عبدالمجید سالک نے اپنی کتاب ''ذکرِ اقبال'' میں لکھا ہے کہ 1912ء کے لگ بھگ علامہ اقبال کا جاپان جانے کا منصوبہ بن رہا تھا۔ جس کی تجویز مولانا ظفر علی خاں نے دی تھی۔ اقبال کا جاپان کے دورے کا منصوبہ تو بوجوہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا لیکن ان کا ذکر آج ایک صدی بعد بھی جاپان میں جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔

✦✦✦


## سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلباء اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

| | | |
|---|---|---|
| مضامین پطرس | پطرس | 140/- روپے |
| مضامین فرحت اللہ بیگ | مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی | 350/- روپے |
| جاڑے کی چاندنی | غلام عباس | 200/- روپے |
| مراۃ العروس مع فرہنگ | ڈپٹی نذیر احمد | 200/- روپے |
| اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے | ڈاکٹر معین الدین عقیل | 700/- روپے |
| اُردو ادب کا ارتقاء | ڈاکٹر وحید قریشی | 150/- روپے |
| اُردو تنقید (انتخاب مضامین) | پروفیسر اشتیاق احمد | 700/- روپے |
| اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ) | ڈاکٹر یوسف حسین خان | 800/- روپے |
| مقدمہ شعر و شاعری | الطاف حسین حالی | 200/- روپے |
| مقالات اقبال | عبدالواحد معینی | 400/- روپے |
| تنقیدات تحسین فراقی | پروفیسر اشتیاق احمد | 700 روپے |
| تنقید اور مجلسی تنقید | ڈاکٹر وزیر آغا | 300/- روپے |
| تحقیق شناسی | ڈاکٹر رفاقت علی شاہد | 500/- روپے |
| اصلاح تلفظ و املاء | طالب ہاشمی | 250/- روپے |
| اُردو کے 25 افسانے | ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر | 500/- روپے |
| نیا افسانہ اور قاری | ڈاکٹر طاہر تونسوی | 250/- روپے |
| ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ | ڈاکٹر محمد اشرف خان | 250/- روپے |
| فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ) | ڈاکٹر طاہر تونسوی | 400/- روپے |
| داستان اقبال | آمنہ صدیقہ | 200/- روپے |

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

# نجیب احمد/لاہور

ایسا نہ ہو کہ وہ بھی مجھے چاہنے لگے ایسا ہوا نہیں ہے، مگر ہونا چاہیے

نجیب احمد کے فنی مقام کے تعین کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ قاری سے براہِ راست ارتباط پر قدرت رکھتے ہیں اور نہایت سہل انداز میں قاری کے دل اور حسیات پر اثر انداز ہوتے ہوئے اُسے اپنے شیشۂ اندیشہ میں اُتار لاتے ہیں۔ جہاں وہ بادۂ خیال سے مخمور رہتا ہے۔ یہی خمار شاعر کا فنی اوجِ کمال ہوتا ہے جہاں قارئین کے سن ہائے ناگفتہ و ناتراشیدہ شاعر کے کمالِ فکر سے بآسانی آشنا ہو کر معنویت کی منازل طے کر سکتے ہیں۔ (حسنین سحر)

ٹھنڈا سا ایک سانس لیا اور چل دیا
اُس نے کسی سے کچھ نہ کہا اور چل دیا
دیوار و در پہ ڈال کے اک سرسری نظر
کچھ زیرِ لب کلام کیا اور چل دیا
اُس کے دل و دماغ میں چل تو رہا تھا کچھ
چپ چاپ بزم سے وہ اٹھا اور چل دیا
آیا نہ آئینے کے مقابل تمام عمر
اپنے سوا وہ سب سے ملا اور چل دیا
دریا کی شرط تشنہ دہن کو نہ تھی قبول
پانی کا گھونٹ تک نہ پیا اور چل دیا
پہلے تو اُس نے غور سے دیکھا اِدھر اُدھر
پھر مجھ کو اپنے ساتھ لیا اور چل دیا
میری صدا پہ رُک تو گیا تھا وہ پر نجیبؔ
پل بھر نہ انتظار کیا اور چل دیا

آنکھیں جو روشنی کے اندھیروں سے بھر گئے
اب کیا بتائیں ہم کہ وہ اٹھ کر کدھر گئے
مہتاب نے بھی آخرِ شب گھر کی راہ لی
ہم بے گھری کو ساتھ لیے در بہ در گئے
دیکھا کسی نے یا نہیں دیکھا، خبر نہیں
ہم سر جھکائے اُس کی گلی سے گزر گئے
یک دم کسی نے ریل کی زنجیر کھینچ دی
گاڑی رکی تھی دشت میں، ہم بھی اُتر گئے
صحرا تو جست بھر کی مسافت ہے اس لیے
اُس کو ٹھہرتا دیکھ کے ہم بھی ٹھہر گئے
جن کی روانیوں سے تھی سرسبز یہ زمیں
کوئی بتا نہ پایا وہ دریا کدھر گئے
تاریکیوں کی اوٹ میں کیا جانے کیا ہوا
پو پھوٹتے ہی شہر میں نوحے بکھر گئے
نزدیک آ کہ روح بھی پہچان لے نجیبؔ
دل میں بسے ہوئے تجھے برسوں گزر گئے

اس باغ میں اک ایسا شجر ہونا چاہیے
پتوں کے ساتھ جس پہ ثمر ہونا چاہیے
اس دن کا بھی شمار معزز دنوں میں ہو
یہ دن بھی اُس گلی میں بسر ہونا چاہیے
گرتے لہو نے برسرِ دربار یہ کہا
اس طشت میں تو شاہ کا سر ہونا چاہیے
لازم نہیں کہ ایک سا انجامِ کار ہو
اس دشت میں اک اور سفر ہونا چاہیے
ایسا نہ ہو کہ وہ بھی مجھے چاہنے لگے
ایسا ہوا نہیں ہے، مگر ہونا چاہیے
اتنے کٹھور ہوتے نہیں اہلِ دل نجیبؔ
اک دوسرے کی ہم کو خبر ہونا چاہیے

یوں نہ بے کار بیٹھے رہیں، کچھ کریں
سوچ کے ہاتھ میں ہاتھ دیں، کچھ کریں
ہاتھ پھیلائیں لیکن پروں کی طرح
اپنے کس بل پہ اُڑنے لگیں، کچھ کریں
شب کے بے نور اوراق پہ کم سے کم
نقشِ خورشید ہی کھینچ دیں، کچھ کریں
وقفِ غم کے لیے، چشمِ نم کے لیے
آؤ رومال ہی لے چلیں، کچھ کریں
کارِ خدمت زبانی بہت ہو چکا
آؤ اب واقعی کچھ کریں، کچھ کریں
لب ہیں خاموش لیکن برائی کو ہم
دل ہی دل میں برا تو کہیں، کچھ کریں
شاخِ گریہ سے اچھے دنوں کی نجیبؔ
کوئی اُمید ہی باندھ لیں، کچھ کریں

حصارِ آب شر میں آ گئی ہے
مری کشتی بھنور میں آ گئی ہے
نہ جانے کس گلی کی دھول اُٹھ کر
ہوا کے ساتھ گھر میں آ گئی ہے
کسی کے حسن کی خوش رنگ جھلمل
تب و تابِ سحر میں آ گئی ہے
نجیبؔ اک دن خیالوں میں اُڑے تھے
تھکن کیوں بال و پر میں آ گئی ہے

عکس منظر میں پلٹنے کے لیے ہوتا ہے
آئینہ گرد سے اٹنے کے لیے ہوتا ہے
شام ہوتی ہے تو ہوتا ہے مرا دل بے تاب
اور یہ تجھ سے لپٹنے کے لیے ہوتا ہے
یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں کئی دنیاؤں کو
ایسا پھیلاؤ سمٹنے کے لیے ہوتا ہے
علم جتنا بھی ہو کم پڑتا ہے انسانوں کو
رزق جتنا بھی ہو بٹنے کے لیے ہوتا ہے
سائے کو شامل قامت نہ کرو آخرکار
بڑھ بھی جائے تو یہ گھٹنے کے لیے ہوتا ہے
گویا دنیا کی ضرورت نہیں درویشوں کو
یعنی کشکول اُلٹنے کے لیے ہوتا ہے
مطلع صبحِ نمو صاف تو ہوگا آزر
ابر چھایا ہوا چھٹنے کے لیے ہوتا ہے

ٹوٹ کر نیند نے آنکھوں کا بھرم توڑ دیا
صبح کے شور میں اک خواب نے دم توڑ دیا
پھینک کر سنگِ خموشی کسی دیوانے نے
گنگناتی ہوئی ندی کا ردھم توڑ دیا
اک صدی بیچ سے غائب ہوئی آوازوں کی
ماترے گنتے ہوئے وقت نے سم توڑ دیا
میرے رستے کے علاوہ بھی کئی رستے تھے
کیوں قدم رکھ کے مرا نقشِ قدم توڑ دیا
کس نے دستار لپیٹی پہ تسکین جہاں
کس نے وہ سلسلہ جاہ و حشم توڑ دیا
کثرتِ جذب میں دوری کو تسلسل دے کر
عشق نے وصل کے ماروں پہ ستم توڑ دیا
اس نے پوچھا کہ کوئی آخری خواہش آزر
میں نے اک نام لکھا اور قلم توڑ دیا

مرہمی حد سے گزرنے کی پڑی رہتی ہے
زخم اتنے ہیں کہ بھرنے کی پڑی رہتی ہے
سانس روکے ہوئے آئینے کی حیرت سے اُدھر
اُس پری رو کو سنورنے کی پڑی رہتی ہے
مرنے والوں ہی سے کچھ ربط بڑھایا جائے
جینے والوں کو تو مرنے کی پڑی رہتی ہے
رحم آتا ہے مجھے ایسے فرشتوں پہ جنہیں
کام کو وقت پہ کرنے کی پڑی رہتی ہے
ایک اک لمحہ گزرتا ہے بہت مشکل سے
ایک اک سانس بسرنے کی پڑی رہتی ہے
کشتیٔ صبر بھی غرقاب نہ ہو جائے کہیں
موجِ ہر خوں کو بپھرنے کی پڑی رہتی ہے
کیسے رک جاؤں گزشتہ کا سہارا لے کر
وقت کو مجھ سے گزرنے کی پڑی رہتی ہے
ہم محبت کو چھپانے میں لگے ہیں آزر
اور خوشبو کو بکھرنے کی پڑی رہتی ہے

کھینچ کر عکس فسانے سے الگ ہو جاؤ
بے نمو آئینہ خانے سے الگ ہو جاؤ
سارا دن ساتھ رہو سائے کی صورت اپنے
شام ہوتے ہی بہانے سے الگ ہو جاؤ
شعر وہ لکھو جو پہلے کہیں موجود نہ ہو
خواب دیکھو تو زمانے سے الگ ہو جاؤ
شاعری ایسے جھمیلوں سے بہت آگے ہے
اس نئے اور پرانے سے الگ ہو جاؤ
نیند میں حضرتِ یوسف کو اگر دیکھا ہے
عین ممکن ہے، گھرانے سے الگ ہو جاؤ
احتراماً مرے حلقے میں ہوئے تھے شامل
اہتماماً مرے شانے سے الگ ہو جاؤ
اس کو تصویر کرو صفحہ دل پر آزر
غیب کا نقش بنانے سے الگ ہو جاؤ

جاتا بھی کہاں جسم کے پیکر سے نکل کر
منظر میں ہی موجود ہوں منظر سے نکل کر
ممکن ہے میں آدھا بھی نہ پہنچوں کہ وہاں تک
جانا ہے مجھے اس کے برابر سے نکل کر
ساحل نے کئی بار یہ دیکھا ہے کہ لہریں
پانی میں اُترتی ہیں مرے سر سے نکل کر
اک مچھلی یہی دیکھنے آئی سرِ ساحل
کشتی کہاں جاتی ہے سمندر سے نکل کر
سب لوگ سمجھتے ہیں میں تنہا ہوں جہاں میں
باہر کبھی آؤ مرے اندر سے نکل کر
خوں خوار اندھیرے کی حکومت ہے گلی میں
اس وقت کہاں جائے کوئی گھر سے نکل کر
وہ غیب سے اُبھرا ہے سرِ عرصۂ دنیا
میں سامنے آیا ہوں میسر سے نکل کر
اس چشمہ پُرسوز کا اک ساز ہوں آزر
جو رزقِ سماعت ہوا پتھر سے نکل کر

احمد سبحانی آکاش/لاہور

# سراپا

اس کو سوچوں تو ذہن میں اکثر
اُس کی یادوں کے پھول کھلتے ہیں
خوشبوئیں پھوٹتی ہیں رگ رگ سے
خواہشوں کے چراغ جلتے ہیں
رنگ نظروں میں رقص کرتے ہوئے
ایک پیکر میں جب سمٹ جائیں
اُس کی تصویر سامنے آئے
پرکشش، جاذبِ نظر چہرہ
خوبصورت ہے کس قدر چہرہ
اک نظر دیکھنے کے بعد اُسے
بھولنا آدمی کے بس میں نہیں
سوچتا ہے دماغ بھی اُس کو
دل تو رہتا ہی دسترس میں نہیں
اُس کی زُلفوں کا بال، بال الگ
جیسے ریشم کے تار سلجھے ہوئے
جیسے مخمل کا نرم سا احساس
جیسے جھرنے کی دھار گرتی ہوئی
لہر یا لہر یا ندی سی کوئی
جس میں خنکی بھی ہو لطافت بھی
جس کے ہر بل میں زندگی اٹکے
جس کو دیکھیں تو روشنی چمکے
خوبصورت فراخ پیشانی
اُس کے عقلِ سلیم کی مظہر
اس کے ذوقِ جمیل کی تمثیل
اُس کے اچھے مزاج کا عنصر
جس طرح آدھا چاند بدلی میں
جیسے سورج اُگے سمندر سے
جیسے ہیرا تراش رکھا ہوا
جیسے قوسِ قزح ہو اندر سے
اُس کے ترچھی کٹار سے ابرو
حُسن کے شاہکار سے ابرو
تیز کاجل کی دھار سے ابرو
اُس کے رُخ پر قطار سے ابرو
ان کی جنبش میں راز پنہاں ہیں
جن کو آنکھوں سے سننا پڑتا ہے
سونگھ لیتے ہیں لوگ باتوں کو
راز پردے میں رکھنا پڑتا ہے
اُس کی آنکھیں کمال آنکھیں ہیں
رُعبِ حسن و جمال آنکھیں ہیں
ہرنیوں کی مثال آنکھیں ہیں
ایک نادیدہ جال آنکھیں ہیں
جو بھی ان کا شکار ہو جائے
وہ طلسمات ہی میں کھو جائے
جب ان آنکھوں میں رنگ بھرتے ہیں
اس کے نیناں کلام کرتے ہیں
جن کی باتوں میں اک نشہ سا ہے
اس نشے کا سرور ہے ایسا
اُس کی تاثیر بڑھتی جاتی ہے
وہ جو لفظوں میں آ نہیں سکتا
اور تکمیل پا نہیں سکتا
اس کی آنکھیں غضب کی پیاری ہیں
اُس کی آنکھوں پہ زندگی قربان
اُس کی آنکھوں کے درمیاں، بنی
اپنی ندرت کے گیت گاتی ہوئی
اپنی قسمت پہ ناز کرتی ہوئی
اور ہلکا سا مسکراتی ہوئی
اُس کے رخسار کی ملاحت پر
روشنی کا گمان پڑتا ہے
مسکراتے ہیں جب بھی لب اُس کے
گال پر بھی نشان پڑتا ہے
نرم رُخسار تھوڑے اُبھرے ہوئے
بیضوی چہرے کو نکھارتے ہیں
جب میں دیکھوں انہیں تو چپکے سے
میرے جذبات کو اُبھارتے ہیں
احمریں لب نزاکتوں سے بھرے
رس کے پیالے، لطافتوں سے بھرے
کیا حسیں لب ہیں جیسے ترشے ہوئے
سنگ مرمر پہ لعل رکھے ہوئے
پھول کی پنکھڑی سے بھی نازک
ریشمی، اطلسی، ملائم سے
ان میں نرمی بھی ہے حلاوت بھی
ان کی خوشبو سے زندگی مہکے
ان کی قربت میں جو بھی ہو چہکے
اُوپری لب کمان کی صورت
نیچے والا ہے چاند چھ دن کا
اوپری درمیاں سے نوکیلا
نیچے والا اُٹھان آمادہ
مسکراتے ہیں جب یہ لب اس کے
گیت گاتے ہیں روز و شب اُس کے
جب وہ ہنستی ہے موتیوں کی چمک
پھوٹتی ہے کرن، کرن کی طرح
موتیے کی سفید کلیاں سی
جگمگائیں زتن، زتن کی طرح
اس کی میٹھی زبان کی باتیں

خواہشوں کے جہان کی باتیں
سب کہاں ہیں بیان کی باتیں
چھوڑ دے درمیان کی باتیں
اُس کی آواز کھنکھناتی ہوئی
نغمگی کے قریب جاتی ہوئی
نرم لہجے سے جگمگاتی ہوئی
ناز پرور ہے لوچ کھاتی ہوئی
جیسے "لے" لو کی لہر بن جائے
جیسے "سُر" ساز میں سمٹ جائے
اُس کی آواز روپ دھارے اگر
لوگ آواز سے لپٹ جائیں
اُس کی ٹھوڑی کلی ہے کھلتی ہوئی
جانب گوش ہے سفر جس کا
بازو کھولے لبوں سے ملتی ہوئی
اُس کی ٹھوڑی کے عین کچھ پیچھے
زخم کا اک نشاں ہے بچپن سے
اُس کی گردن حساس ہے اتنی
سانس کی آنچ بھی نہ سہہ پائے
اپنی گولائی کے تناسب پر
خود ہی شرمائے اور بل کھائے
اس کے شانے ہیں شاہکار کوئی
خوش نما اور گداز سے بھرپور
اُس کے شانوں پہ جب گریں زُلفیں
بے تحاشہ حسیں لگیں زُلفیں
ایک قاتل ہے دائیں شانے پر
ایک قاتل ہے بائیں بازو پر
اور ہے ایک دائیں آنکھ کے پاس
اس کے بازو بدن کی شاخیں ہیں
جن پہ دو ہاتھ ہیں ملائم سے
جن کی مخروطی اُنگلیوں کا لمس
سحر کاری کے فن میں یکتا ہے
آپ اپنی مثال رکھتا ہے
اس کا جوبن بہار کی تصویر
وادیٔ پروقار کی تصویر
جس کے گھر گھر پہ آنکھ رک جائے
ہوش والا جہاں بھٹک جائے
دائرے سے پڑیں نگاہوں میں
رنگ اُڑنے لگیں ہواؤں میں
کیا نشیب و فراز ہیں اُس کے
جو ہیں ظاہر وہ راز ہیں اُس کے
اُس کے دامن پہ راج خوشبو کا
جیسے مہکا ہوا گلاب کوئی
جس کی تاثیر کے نشے کا یہاں
کیا تقابل کرے شراب کوئی
اُس کی آسودگی بتاتی ہے
اُس کی محنت بھی اس میں شامل ہے
ہر ہنر اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل
اور وہ اپنے فن میں کامل ہے
گنگناتی ہے اپنی مستی میں
اپنے جذبوں میں ڈھال کر خود کو
جگمگاتی ہے اپنی مستی میں
زندگی کے سبھی مسائل کو
بھول جاتی ہے اپنی مستی میں
اُس کے ہونٹوں پہ آئے جس کا نام
زندگی سے فقط اُسے ہے کام
اُس کے پیڑوں کے بھی گھنے سائے
جن میں بیٹھیں تو نیند آ جائے
دل کشی جن کے حسن کی تاثیر
جیسے مل جائے خواب کی تعبیر
پاؤں نازک مزاج ہیں ایسے
کارپٹ پاؤں میں گڑا جائے
جی یہ چاہے کہ اس کا نقش قدم
میرے دل پر ہی پائے جو پائے
اُس کے پیکر سے روشنی جھانکے
اُس کے گیسو مہکتے رہتے ہیں
اُس کی آنکھوں میں ارغوانی سے
دو جواہر چمکتے رہتے ہیں
اُس کے پیکر پہ رنگِ پیراہن
کوئی بھی ہو وہ ایسے جچتا ہے
جیسے صدیوں کے بعد صحرا میں
ایک ننھا سا پھول کھلتا ہے
سر بہ سر لطف کا جہاں ہے وہ
میں زمیں اور آسماں ہے وہ
اُس کی ہر بات ہے الگ سب سے
اُس کے جیسا نہیں یہاں کوئی
وہ جو اس کے مقام سے ہو قریب
اک بھی ایسا نہیں یہاں کوئی
میرے مالک ہمیشہ اُس کے لیے
اپنی رحمت کا در کھلا رکھنا
مہرباں رہنا اُس کی نسلوں پر
اُس کی خواہش کو بارور کرنا
اُس کو آسانیاں میسر ہوں
کوئی مشکل نہ آئے اس پہ کبھی
ہر قدم کامیاب ہو اُس کا
مسئلے اُس کے ختم ہوں سب ہی
میرے مالک ہمیشہ اُس کے لیے
اس کی خوشیوں کے پھول کھلتے رہیں
اس کی ہر آرزو مکمل ہو
اس کے آغازِ جستجو میں اسے
جو تمنا کرے وہ حاصل ہو
میرے مالک ہمیشہ اُس کے لیے
اپنی رحمت کا در کھلا رکھنا

# شہزادیاں

بشریٰ رحمن/ لاہور

وہ بولی "یہ گناہ تو نہیں ہے نا......؟"

"گناہ......" میں نے حیران سی آنکھیں اُٹھائیں۔

"صرف ایک مرد کے ساتھ معاملات رکھنا۔"

"ایک مرد کے ساتھ...... مگر وہ تمہارا شوہر تو نہیں۔"

"تو کیا ہوا......؟ اگر تمہیں ایک مرد سے محبت ہو جائے اور وہ تمہارے سلگتے اور ترستے ہوئے جذبات کو وہ سب کچھ عطا کرے جو تمہارا شوہر دس برسوں میں بھی عطا نہیں کر سکا تو اس کے ساتھ مراسم استوار کرنا گناہ نہیں ہوتا۔ ہاں اگر یہی تعلق عورت بہت سے مردوں کے ساتھ قائم کرے تو پھر گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔"

"تمہاری منطق میری سمجھ سے باہر ہے۔" میں نے کہا "کسی بھی مذہب کے حوالے سے بات کرو۔ ایک شادی شدہ عورت کا، کسی دوسرے مرد کے ساتھ ویسے مراسم رکھنا گناہِ کبیرہ کے زمرے میں آتا ہے۔"

"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔" وہ غصے سے بولی "اور مردوں نے اپنی سہولت کے لیے گھڑلی ہیں۔"

"جو بات غلط دکھائی دیتی ہے میں اسے کیسے صحیح کہہ دوں؟"

"میں تم سے نصیحت سننے نہیں آئی۔" اس کے لہجے سے باغی عورت نکل رہی تھی۔

"میں نے اللہ میاں سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اس ایک مرد کے ساتھ ملوث ہونا میری مجبوری ہے۔ اس کو تو گناہ نہ سمجھنا۔ گناہ تو تب ہو جب میں ہر کسی کے ساتھ......" وہ بولتی رہی ہذیانی انداز میں اور میں بس اس کی سنتی رہی......

اس چار منزلہ رہائشی عمارت کے دوسرے فلور پر عین میرے کمرے کے اوپر ثمن رہتی تھی۔ میں جب نئی نئی اس فلیٹ میں آئی تھی تو میں نے اسے اپنے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر میں مبہوت ہوگئی تھی۔ اس جیسی حسین عورت میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ بس اس جیسے حسن کے بارے میں میں نے کتابوں میں ہی پڑھا تھا۔ وہ تو سرتا پا کسی فنکار کی گھڑی گھڑائی مورتی لگتی تھی۔ جیسے کسی مصور کی شاہکار دیوار گیر Painting ہو۔ سرو قد دودھیا شہابی رنگت دنبالہ دار آنکھیں، ستواں ناک گلاب کی طرح کے ہونٹ، خوبصورت مخروطی انگلیاں گھٹاؤں سے بال......اور چال اُف......

کئی دن میں بس اسے آتے اور جاتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ میں ہی کیا اس بلڈنگ کے سارے رہائشی ثمن کو دیکھتے تھے۔ مرد تو اسے دیکھتے ہی بت بن جاتے۔ تب مجھے احساس ہوتا کہ حسن میں واقعی ایک مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔

اسے اپنے اس حشر اُٹھا دینے والے حسن کا خود بھی احساس تھا۔ اس کا دیکھنے کا انداز بتاتا تھا کہ...... ہم سا ہو تو سامنے آئے۔

مردوں کی بات چھوڑیے...... جس عورت کو عورتیں بھی زلیخا کی سہیلیوں کی طرح دیکھتی ہوں تو وہ کتنی انوکھی اور ہوش ربا ہوگی۔

میں ہمیشہ اس سے باتیں کرنے کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔ میں ایک مقامی کالج میں سائیکالوجی کی پروفیسر ہوں۔ پورے کالج کی لڑکیوں کو دیکھ کر اکثر سوچا کرتی تھی "الٰہی! کیا تو نے حسین چہرے بنانے بند کر دیے ہیں۔ کیا عورت کا سارا حسن صرف کتابوں میں رہ گیا ہے۔" مگر ثمن کو دیکھنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ ابھی تک پریاں انسانی پیکر میں ڈھل رہی ہیں۔

ایک دن میرے دروازے پر کسی نے بیل دی۔ باہر نکلی تو ثمن کھڑی تھی۔

میرا دل اسے دیکھ کر یوں دھڑکا مانو میں کوئی مرد ہوں۔ حیران سی بس دیکھتی جاتی تھی کہ وہ بولی "اندر آجاؤں......؟"

میں نے دروازہ کھول دیا۔ مسکرائی اور اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ وہ ادا سے مسکرائی اور بولی۔

"معاف کیجیے...... میں بیٹھنے نہیں آئی۔ میرے فلیٹ کی چابی کہیں گر گئی ہے اور میرا موبائل بھی کمرے میں رہ گیا ہے۔ میں نے بلڈنگ کی انتظامیہ کو فون کر کے کہنا ہے وہ ماسٹر Key مہیا کر دیں۔ میرا نام ثمن ہے۔ میں آپ کے فلیٹ کے اوپر والے فلیٹ میں رہتی ہوں۔"

"ہاں میں جانتی ہوں۔" کہہ کر میں نے اپنا موبائل اُٹھا کر دیا۔

وہ بولی "نہیں میں لینڈ لائن سے فون کروں گی۔"

میں جلدی جلدی تار لمبی کر کے فون ڈرائنگ

روم میں لے آئی۔ جب تک وہ فون کرتی میں جلدی جلدی ڈرائی فروٹ اور بسکٹ ٹرے میں سجا کر لے آئی۔

وہ خوش ہوگئی۔ ''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ مجھے بھوک لگی ہے۔''

''یہ سمے ہی بھوک کا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ کیا کرتی ہیں؟''

''آپ کیا کرتی ہیں؟''

والے سوالوں نے اس روز ہم دونوں کی واقفیت میں دوستی کی ایک بنیاد رکھ دی۔ اب آتے جاتے ہوئے ہم دونوں ایک دوسرے کو ہیلو ہائے کہنے لگ گئیں۔ بیسمنٹ میں ایک کیفے ٹیریا تھا کبھی کبھی کافی پیتے ہوئے وہاں بھی ملاقات ہوجاتی تھی۔

یہ بلڈنگ جس میں میں رہتی ہوں اس کا نام عروج ہے۔ یہ کسی خاتون کی ملکیت ہے۔ یہ تقریباً ورکنگ کلاس کی عورتوں کی رہائش گاہ ہے۔ میری طرح کی ملازمت پیشہ، شادی شدہ اور بال بچوں دار عورتیں بھی رہتی ہیں۔ اب پاکستان ان ملکوں میں شامل ہوگیا ہے جن ملکوں کی عورتیں ہاؤس وائف کہلانا پسند نہیں کرتیں۔ اس بلڈنگ میں ہر عورت اور ہر لڑکی صبح صبح جاب کے لیے نکل جاتی ہے۔

ثمن سے جب میری بے تکلفی بڑھ گئی تو ایک دن اس نے مجھے خود ہی بتا دیا کہ وہ اپنے شوہر کی تیسری بیوی ہے۔

''تم نے تیسری بیوی بننا کیوں گوارا کیا۔ جبکہ تم کسی شہزادے کی پہلی محبت بننے کے اہل تھیں۔''

''ہاں'' وہ بولی۔ ''میں اپنے آپ کو لیڈی ڈائنا سے کم تو نہیں سمجھتی تھی۔ ایسے کسی معزول شدہ شہزادے کے انتظار میں بیٹھی تھی کہ جنت اللہ حسین وڈیرے نے مجھے کالج سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ پھر اس نے ہر وہ جتن کیا جو مجھے حاصل کرنے کے لیے کر سکتا تھا۔ میرے ماں باپ تنخواہ دار متوسط لوگ تھے۔ دولت کے ڈھیر سے اس نے انکار کے سارے راستے بند کر دیے۔''

''پھر......''

''پھر کیا...... اب میرے بھی تین بچے ہیں۔''

''مگر یوں لگتا ہے جیسے تمہیں ابھی تک کسی نے چھوا تک نہیں......''

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی ''کتنی پیاری بات کی ہے تم نے منی آپا'' (بلڈنگ میں سب مجھے منی آپا کہتے ہیں)

''چھوا تک نہیں اس نے...... جو دل تک پہنچتے ہیں وہی چھو سکتے ہیں۔ ورنہ گوشت کی ہانڈی میں سبزی ڈال کے تو سبھی پکا لیتے ہیں۔''

''تو یہاں کیوں رہتی ہے؟''

''میرا شوہر کراچی میں رہتا ہے۔ ایک بیوی کراچی میں ہے اور ایک جام شورو میں رہتی ہے۔ مجھے اس نے اسلام آباد میں سوکنوں سے بہت دور رکھا ہوا ہے۔''

''وہ تمہارے پاس کب آتا ہے؟''

''آ جاتا ہے......'' وہ آنکھ مار کر بولی ''جب اسے ضرورت پڑتی ہے''

''اتنی خوبصورت بیوی کو اکیلا چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے۔''

''ہاں بیوی تو گائے ہوتی ہے جیسے۔ ادھر ادھر گھاس چرنے نہ نکل جائے۔''

اس دن ہم دونوں مزے مزے کی باتیں کر کے ہنستے رہے۔ یوں ہماری دوستی ہوگئی۔ وہی اکثر میرے کمرے میں آجاتی تھی۔

پھر ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ شوہر کی اجازت سے اس نے ایک این جی او بنالی ہے۔ جو غریب اور یتیم لڑکیوں کی شادی میں مدد کرتی ہے اور ان کے ازدواجی جھگڑے بھی نمٹاتی ہے۔ اس نے ایک دفتر بنایا، عملہ رکھا ہے اور باقاعدہ دفتر جاتی ہے۔

ایک دن گھبرائی ہوئی سی آئی اور کہنے لگی ''میرے شوہر کو شک ہوگیا ہے۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''کیسی مدد......؟''

''میں اکثر اپنے کمرے میں نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی رات کو لیٹ آتی ہوں۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے میں منی آپا کے ساتھ رہتی ہوں اور رات کو ان کے ساتھ فلم دیکھنے چلی جاتی ہوں۔ میں نے ان کو آپ کا نمبر بھی دے دیا ہے۔ اگر کبھی وہ آپ کو فون کریں تو کہہ دینا وہ میرے ساتھ تھی۔''

''مگر......''

''بس آگے کچھ نہیں۔ دوستی کی ہے تو پھر نبھانا ہوگی۔'' میں نبھانے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔

ایک دن میں اپنی کاپیاں لیے کیفے ٹیریا میں بیٹھی تھی۔ آ گئی...... میں نے کہا ''کم کم نظر آنے لگی ہو؟''

بولی ''میرے دل کو کسی نے چھو لیا ہے۔''

''اور تمہارا شوہر...... اور بچے؟''

''میں نے اللہ سے کہہ دیا ہے......'' وہ بولتی رہی، میں سنتی رہی۔

......................

روزینہ میرے ساتھ والے فلیٹ میں رہتی ہے۔ مہینے میں ایک آدھ بار نظر آتی ہے۔ روزینہ یہاں دفتر خارجہ میں ملازمت کرتی ہے۔ گوری چٹی ہے۔ بھرا بھرا جسم ہے۔ مگر کشش نام کی کوئی چیز اس کے اندر نہیں ہے۔ جب بھی نظر آ جائے تو بات ضرور کرتی ہے اور مجھے بھی جیسے ہر ایک کی ٹوہ لگی رہتی ہے۔

ایک دن جب وہ تالا کھول رہی تھی۔ میں نے کہا ''تم نے یہ فلیٹ تفریحاً لے رکھا ہے۔ اکثر تالا رکھا رہتا ہے۔''

''ہاں جب میرا بوائے فرینڈ آتا ہے۔ تو میں یہاں آ جاتی ہوں۔''

''مگر تو تو شادی شدہ ہے۔ تیری دو بیٹیاں بھی ہیں۔''

''اگر میرا شوہر گرل فرینڈ رکھ سکتا ہے تو میں بوائے فرینڈ کیوں نہیں رکھ سکتی؟''

''خدا کا خوف بھی کوئی چیز ہے.....'' میں نے روایتی انداز میں کہا۔

''اگر شوہر کو خدا کا خوف نہ ہو تو بیوی کیوں کرے.....؟''

''بیوی ہی کرتی ہے ہمیشہ.....''

''میں وہ بیوی نہیں ہوں۔ وہ اپنے وزیر کے ساتھ غیر ملکی دوروں پر رہتا ہے۔ وزیر اسے ہر قسم کا عیش کراتا ہے۔ اندرون ملک و بیرون ملک بھی۔ اس کی بچی ہوئی ہڈیاں چباتا رہتا ہے۔''

''کیا یہ نئی بات ہے؟ ہمارے ملک کی اسی فیصد عورتیں اس صورت حال میں صبر کرتی ہیں۔''

''میں ان اسی فیصد احمق عورتوں میں سے نہیں ہوں۔ میرے بھی جذبات ہیں۔ مجھے بھی مرد کی ضرورت پڑتی ہے.....اور وہ چھ چھ ماہ تک مجھے پلٹ کر نہیں دیکھتا۔''

''یہ یورپ اور امریکہ نہیں ہے روزینہ.....''

''نہیں ہے تو بن جائے گا۔ زندگی تو ایک ہی بار ملتی ہے۔ کون سا روز روز دنیا میں آنا ہے۔''

''تیری بیٹیاں بھی جوان ہو رہی ہیں۔''

''تو انہیں جوان ہونے سے کون روک سکتا ہے۔ میں ان کو اپنی مرضی سے اپنی شادی کرنے کا حق دوں گی۔''

''کون ہے تمہارا بوائے فرینڈ.....؟''

''وہ ایک بڑا افسر ہے۔ اسی نے مجھے یہ فلیٹ لے کر دیا ہے۔ وہ جب ٹور پر آتا ہے تو یہاں میرے ساتھ رہتا ہے۔''

''اگر کسی روز تیرے شوہر کو پتہ چل گیا تو.....؟''

''ارے اس کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چل سکتا۔'' اس نے دروازے میں چابی گھمائی ''اور پھر وہ کون سا مجھے ماہانہ خرچہ دیتا ہے۔ کیا وہ اتنا معصوم ہے کہ اسے معلوم ہی نہیں میں گھر کیسے چلاتی ہوں؟''

..................................

شہناز پروین سرگودھا سے آئی ہے۔ سامنے والے فلیٹ میں رہتی ہے۔ کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتی ہے۔ نوجوان ہنس مکھ سانولی سلونی ہے۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ ایک گورا چٹا اونچا لمبا پٹھان منڈا بھی آتا ہے۔

چھ ماہ تک یہ لڑکی چادر اوڑھتی رہی اور کس کے چٹیا بناتی رہی۔ آہستہ آہستہ اس کے بال کھل گئے۔ پھر بال چھوٹے ہو گئے۔ دوپٹہ غائب ہو گیا اور جینز ٹائٹ ہو گئیں۔ بات بات میں انگریزی بولنے لگی۔ ہاتھ میں موبائل رکھنے لگی۔ چلنے کا انداز بدل گیا۔ اپنا نام شین بتانے لگی۔ گزرتے ہوئے ہر چھوٹے بڑے کو ہیلو کہنے لگی۔

ایک روز کیفے ٹیریا میں اکیلی بیٹھی تھی۔ میں نے کہا ''وہ تمہارا منگیتر کہاں ہے؟''

''کون سا.....؟''

''وہی جو اکثر تمہارے ساتھ آتا ہے سمارٹ سا لڑکا۔''

ہنس پڑی ''منی آپا! وہ میرا منگیتر نہیں ہے بوائے فرینڈ ہے۔ میرا کولیگ بھی ہے۔''

''اچھا اچھا میں سمجھی کہ.....''

''نہیں.....'' وہ بولی ''وہ گلگت کا رہنے والا ہے۔ آج اپنے گاؤں گیا ہے۔ جس ویک اینڈ میں وہ یہاں ہوتا ہے تو رہنے کو میرے پاس آ جاتا ہے۔''

''تمہارے فلیٹ میں.....؟''

''ہاں ویک اینڈ ہم یہاں اکٹھے گزارتے ہیں۔''

''یعنی رات بھی یہاں رہتا ہے۔''

''ہاں ہاں.....'' وہ ہنسنے لگی ''میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔''

''تو تم اس سے شادی کر لو.....''

''شادی میں یہی کچھ تو رکھا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا شین.....؟''

''چھوڑو منی آپا.....ہم لڑکیاں چھوٹے شہروں سے بڑے بڑے آدرش لے کر بڑے شہروں میں آ جاتی ہیں۔ والدین ہماری طرف سے گویا بے پرواہ ہو جاتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کماؤ لڑکیاں ہیں خود ہی اپنی

شادی کر کے ہمیں اطلاع دے دیں گی۔ بس یہی ہے دکھ بھرا انجام۔''

''اگر یہ لڑکا تمہارا فرینڈ ہے۔ تو تم اسے کہو تم سے شادی کرے۔''

''آپا وہ پہلے سے شادی شدہ ہے...... اور میں اس کی دوسری بیوی بننا نہیں چاہتی۔''

''تو......'' ''تو بس ٹھیک چل رہا ہے ایسے بھی......''

..........................

میں مسمات میمونہ مخدوم جب پیدا ہوئی تو ساتویں بہن تھی۔ میری ماں کی توانائی اور رعنائی پہلے بچوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ اس لیے میرا قد چار فٹ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ رنگ گندمی اور نقش بدزیب رہے۔ کافی عرصہ تک کسی کو میرے لیے کوئی مناسب نام ہی نہیں سوجھا۔ سب مجھے بس منی کہہ لیتے تھے۔ سکول میں داخلے کے وقت کسی نے میرا نام میمونہ رکھ دیا۔

صورت کی کمی قدرت نے ذہن سے پوری کر دی۔ امتحانوں پہ امتحان پاس کرتی میں سائیکالوجی میں ایم اے کر بیٹھی۔ ملازمت بھی مل گئی...... مگر رشتہ نہیں ملا۔

کیسے ملتا۔ نہ صورت نہ شکل، نہ قد نہ بت......

ایک بار اخبار میں شادی کا ایک اشتہار شائع ہوا۔ جرمنی میں رہنے والے ایک کاروباری کو پاکستانی بیوی درکار تھی۔ عمر کی قید نہیں تھی۔ میرے بہن بھائیوں نے باہم سازش کر کے بندہ بلا لیا اور فٹافٹ میرا بیاہ کر دیا۔ شادی کی رات اس نے مجھے دیکھا اور میں نے اس کو......

وہ مجھے دیکھ کر صدمے سے دوچار ہوا...... اور میں اسے دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گئی۔ وہ اونچا لمبا بہت خوبصورت صحت مند پچاس سال کا جوان تھا۔ مجھے دیکھ کر سامنے صوفے پر بیٹھ گیا......

تھوڑی دیر سگار پیتا رہا اور پھر کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے گلا صاف کیا اور بولا ''جو تصویر ان لوگوں نے مجھے بھیجی تھی...... اس سے مجھے کچھ بھی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ یہ ٹھیک ہے شادی ایک لاٹری ہوتی ہے...... لاٹری نہ نکلنے پر رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے۔''

میں سمجھ گئی اور باقاعدہ رونے لگی۔ ''میرے ساتھ یہ دھوکا جبراً کیا گیا تھا اور میں بھی لاٹری نکلنے کی آس میں آ بیٹھی تھی۔'' روتے روتے میں کھڑی ہو گئی اور میں نے اس کے ہاتھ جوڑ دیے۔

وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ وہ کھڑا ہو کر مجھے اپنے چھوٹے قد کا احساس نہیں دلوانا چاہتا تھا۔ کہنے لگا ''میں نے اپنی ماں کے ساتھ کچھ ایسا ہی کیا تھا۔ وہ میری شادی کر کے مجھے جرمنی بھیجنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی ایک بھتیجی سے میرا زبردست نکاح کر دیا اور اگلے دن بارات لے جانے کی بجائے میں بھاگ کر جرمنی آ گیا تھا۔ وہاں میں نے ایک جرمن عورت سے شادی کی تھی۔ ایک بیٹی ہوئی۔ مگر شادی چلی نہیں۔ سوچا اس عمر میں ایک شادی پاکستانی عورت سے کر لوں۔''

''مگر...... آپ...... معاف کیجیے...... میں آپ کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا اور آپ کے ساتھ جھوٹ بھی نہیں بول سکتا کہ وہاں جا کر آپ کو بلا لوں گا۔ اس عمل کے لیے آپ جیسے کہیں میں تلافی کرنے کو تیار ہوں۔ میں آپ کے ساتھ کچھ نہیں کروں گا...... ایسا جس کا آپ کو اور مجھے پچھتاوا ہو۔ آپ کا کوئی مطالبہ ہو تو مجھے بتا دیں۔''

میں کافی رو چکی تھی۔ فضول سا میک اپ بھی بہہ چکا تھا۔ وہ میری طرف رحم بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں اس کے سگار کی رومانٹک خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک شہزادے کی طرح دلکش نظر آ رہا تھا۔

میرے اندر...... کسی ثمن، کسی روزینہ، کسی شین نے انگڑائی لی۔ مدتوں اندر سوئی ہوئی جوان عورت بیدار ہو گئی۔ اپنا حق مانگنے لگی۔ اس کے قدموں سے لپٹنے کے لیے بے تاب ہونے لگی۔ اس عورت کے نقش و نگار نہیں ہوتے، کوئی قد بت نہیں ہوتا۔ اس عورت کا بس دل ہوتا ہے اور ایک جسم ہوتا ہے۔

''بولیے...... آپ کیا چاہتی ہیں؟'' ثمن، روزینہ اور شین نے غل مچایا۔ کہہ دے نگی۔

میں نے اپنے وجود سے کھینچ کر بمشکل آواز نکالی ''آپ مجھے اپنا نام دے دیں۔ طلاق دیں یا نہ دیں۔ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ایک عورت کو شوہر کے نام کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے بہن بھائیوں کو پتہ نہ چلے کہ آپ مجھے چھوڑ چکے ہیں اور میں میمونہ مخدوم کے نام کے ساتھ زندگی گزار لوں گی۔''

اس شخص کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے......

مجھے حیرت سے دیکھتا رہا۔

وہ ایک فقرہ کلبلایا...... میرے جی کے اندر......

مجھے جینے کا جواز چاہیے...... اس دنیا میں آنے کا کوئی مقصد...... کوئی لمحہ...... کوئی حل...... کوئی گھنگھرو جو احساس کی پائل میں بجتا رہ جائے...... ایک فقرہ...... جو مجھ سے ترتیب نہ دیا جا سکا۔ حلق سے باہر نہ آ سکا۔

روایات اور شرم و حیا کے جزدان میں لپٹا میری زبان کی رسّی پر اسی طرح دھرا ہے آج تک!

# زبیدہ لاج

سیما پیروز/لاہور

برسوں بعد آج وہ سب زبیدہ لاج میں اکٹھے ہوئے تھے۔ ناشتے کی میز پر اس نے نظر دوڑائی۔ ماشاءاللہ سب کرسیاں بھری ہوئی تھیں۔ بلکہ کچھ لوگ ادھر ادھر کھڑے بھی تھے۔ یہاں وہاں ان لوگوں کے بچے ان کا مستقبل بھرا ہوا تھا۔ مگر ماضی وہ تو کہیں بھی نہیں تھا۔ دور کہیں بہت پیچھے وقت کی گرد میں کھو گیا تھا۔ اس نے چشم تصور سے دیکھا وہاں میز کے کنارے والی کرسی پر ابا جی بیٹھا کرتے تھے۔ لمبے چوڑے، سرخ و سفید چہرے پر گھنی مونچھیں۔ شاید مونچھوں کی وجہ سے ان کی شخصیت بڑی بارعب لگا کرتی تھی۔ پولیس کی وردی ان پر کتنی بجتی تھی۔ ان کی ساتھ والی کرسی پر اماں اور پھر وہ چھ بہن بھائی۔ ابا جی وقت کے بہت پابند تھے۔ اس لیے سردیاں گرمیاں صبح ساڑھے سات بجے ناشتے کی میز پر موجود ہوتے۔ اسی طرح رات کا کھانا پورے آٹھ بجے کریمن بوا میز پر لگا دیتی تھیں۔ چھٹی والے دن اُن لوگوں کا جی چاہا کرتا کہ وہ دیر تک سوتے رہیں۔ مگر ابا جی کے خوف کے مارے عین وقت پر پٹ سے آنکھ یوں کھل جاتی جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔ حالانکہ ابا جی نے آج تک بچوں کو نہ ڈانٹا تھا نہ کبھی مارا پیٹا تھا۔ شاید پولیس کی ملازمت کی وجہ سے ان کے مزاج میں تھوڑی سختی تھی۔ ورنہ وہ ملازموں تک کو نہیں ڈانٹتے تھے۔ البتہ اگر گھر میں کبھی کوئی بھولے سے کسی مقدمے کی سفارش یا رشوت کے طور پر کچھ لے کر آ جاتا تو پھر ان کا غصہ دیکھنے والا ہوتا۔ اس وقت سب ڈر کے مارے کانپ رہے ہوتے اور سب بہن بھائی کونے کھدروں میں چھپے پھرتے۔ ایسے میں اماں ان سب کو اپنے گرد ایسے اکٹھا کر لیتیں جیسے مرغی خطرے کے وقت اپنے چوزوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے۔

اماں بڑے دھیمے لہجے میں انہیں سمجھاتیں ”دیکھو تمہارے ابا جس پر غصہ ہو رہے ہیں وہ انہیں رشوت دے رہا تھا۔ آپ کو معلوم ہے نا رشوت لینا اور دینا گناہ ہے۔“

”آہ پیاری اماں!“ ان کی یاد سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ تو سچ مچ کی جنت تھیں۔ ٹھنڈی میٹھی چھاؤں والا گھنا درخت جس کی چھتر چھایا میں کتنی شانتی اور سکھ تھا۔ اپنی ساری اولاد کو فرداً فرداً ان کے مزاج کے مطابق برتنے اور سمجھنے والی۔

اماں ابا کی یاد سے آنکھوں میں آنے والے آنسو صدف نے انگلی کی پور سے صاف کیے اور دل میں اُٹھتی ہوک کو دل ہی میں دبا لیا۔ ”ہائے کہاں گئے وہ دن اور وہ پیارے لوگ.....“

صبح دم آنکھ کھلتی تو اماں سفید دوپٹے کی بکل مارے ان سب بہن بھائیوں پر نماز کے بعد دم پڑھ کر پھونک رہی ہوتیں اور بڑے بھائیوں کو نماز کے لیے کتنے پیار سے جگا رہی ہوتیں۔

اکثر ایسا ہوتا کہ اماں نماز کے بعد تلاوت کر رہی ہوتیں اور صدف ان کی گود میں لیٹ جاتی۔ وہ تلاوت بھی کرتی جاتیں اور صدف کے سر اور چہرے پر ہاتھ بھی پھیرتی جاتیں۔ کیا سرور ملتا تھا اور ایسی میٹھی غنودگی چھا جاتی کہ وہ جانے کن جہانوں کی سیر کو نکل جاتی۔ مدہوشی اس وقت ٹوٹتی جب اماں تلاوت ختم کر چکتیں۔

”آئے ہائے......سو گئی۔ اب اٹھ جاؤ میری ٹانگ بالکل شل ہو گئی ہے۔ اتنی بڑی لوتھا ہو گئی ہو۔ پر بچپنا ابھی تک نہیں گیا۔“

وہ اُٹھنے کی بجائے اور زیادہ اماں سے لپٹ جاتی۔ اپنے دونوں بازو ان کی کمر کے گرد حمائل کر کے اور زیادہ ان کی گود میں گھسی جاتی۔ کیسی پیاری اور سوندھی سوندھی خوشبو آتی تھی اماں کے بدن سے۔

”اماں! کونسا پرفیوم استعمال کرتی ہیں آپ؟“ صدف لمبا سانس بھر کے خوشبو سونگھتی۔

”پاگل......صبح صبح میں نے کون سا پرفیوم لگانا ہے۔“

ابا کے ساتھ وہ لوگ جا بجا گھومتے رہتے تھے۔ دو تین سال سے زیادہ کبھی ایک جگہ پر ٹکتے ہی نہیں تھے۔ ہر ٹرانسفر پر اماں سخت بیزار ہوتیں۔ تو اب پھر سامان باندھو اور چل پڑو۔ عجب خانہ بدوشوں والی زندگی ہے۔ جہاں ذرا دل لگنے لگتا ہے وہاں سے کوچ کا حکم مل جاتا ہے۔“

”نوکری جو ہوئی۔ میں کون سا خوشی سے دھکے کھاتا پھرتا ہوں۔“ ابا خفا سے ہو جاتے۔

”بچوں کی پڑھائی کا کتنا حرج ہوتا ہے۔ آپ کی ٹرانسفر بھی تو ایک سے ایک پس ماندہ ضلعوں میں ہوتی ہے۔ آپ کے کئی کولیگ بڑے بڑے شہروں میں مزے سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہاں سے ہلنے کا نام نہیں لیتے۔ انہیں کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں؟“

”زبیدہ بیگم! تم بھی جانتی ہو۔ نہ میں رشوت خور ہوں نہ افسروں کی چاپلوسی کرتا ہوں۔ میرے جیسے بندے اسی طرح شٹل کاک بنے رہتے ہیں۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ تمہیں ایک ایماندار افسر کی بیوی ہونے پر فخر ہونا چاہیے۔“

پھر ایک دن ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے ابا دونوں ٹانگوں اور ایک بازو کا نذرانہ دے کر گھر آ گئے۔ سرکار کی طرف سے تمغہ جرات اور ایک پلاٹ

ملا۔

''لو بھئی اب تمہیں شہر شہر نہیں گھومنا پڑے گا۔''

ابا نے اماں سے مذاق کیا تو اماں کی چیخیں نکل گئیں۔ دنوں، مہینوں ہم سب سہمے سہمے اداس اور پریشان سے پھرتے رہے۔ ایک روز اباجی نے اماں اور ہم سب کو اپنے پاس بلالیا۔

''زبیدہ! تم سب کو کیا ہوگیا ہے؟ میں زندہ سلامت ہوں۔ اگر میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ ختم ہوجاتا تو تم لوگ کیا کرسکتے تھے۔ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ آئندہ میں گھر میں ایسی ماتمی فضا نہ دیکھوں۔''

گھر بنانے سے پہلے ابا اور ماں کی کتنی بحث ہوا کرتی تھی۔ وہ اماں جنہوں نے زندگی بھر اباجی سے کبھی اختلاف نہیں کیا تھا کیسا کیسا ابا سے خفا ہوتی تھیں۔ ابا ایک کنال پر تین چار بیڈ روم کا گھر بنانا چاہتے تھے۔ اماں بضد تھیں کہ ان کا ماشاء اللہ بھرا پرا کنبہ ہے اس لیے کم از کم چھ بیڈروم کا گھر ہونا چاہیے۔

''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے اتنا بڑا گھر کیا کروگی؟''

''چار بیڈروم چاروں بیٹوں کے لیے ایک ہمارا کمرہ اور ایک گیسٹ روم۔''

''بچے کیا ساری عمر تمہارے گھٹنے سے لگ کر بیٹھے رہیں گے۔''

''اور کہاں جائیں گے...... بیٹیاں تو خیر بیاہ کر اپنے گھر بار والی ہوجائیں گی۔ مگر بیٹے بہوئیں اور ان کے بچے تو ہمارے پاس ہی رہیں گے۔ پھر بیٹیاں بھی تو خیر سے میکے آیا کریں گی۔''

''تم بالکل نادان ہو۔ میری بات یاد رکھو کبھی ان خالی کمروں کو دیکھ کر رویا کروگی۔''

''اللہ نہ کرے۔ کیسی بدفالی منہ سے نکال رہے ہیں۔ بس آپ بڑا گھر بنا کر نہیں دینا چاہتے تو نہ سہی۔'' اماں رنجیدہ سی ہوکر بیٹھ جاتیں۔

جیت آخر اماں کی ہوئی اور زبیدہ لاج کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اباجی نے ساہی وال والا اپنا آبائی گھر اور سرکار کی طرف سے جو پلاٹ ملا تھا اس کو بیچ کر ایک نئی سوسائٹی میں دو کنال پر پانچ بیڈ رومز کا بڑا خوبصورت بنگلہ بنوایا۔

جس روز وہ نئے گھر میں شفٹ ہوئے اُن سب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ گھر کے باہر اماں اپنے نام کی تختی دیکھ کر پھولے نہیں سمارہی تھیں۔

اس گھر میں آنے کے دو تین سال بعد بڑے بھیا ڈاکٹر اور چھوٹے انجینئر بن گئے۔ اماں نے دونوں بیٹوں کی ایک ساتھ شادی کی۔ دو بہوئیں گھر لاکر مارے خوشی کے اماں کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ کیسا بھرا پرا گھر تھا۔

''بڑے بھیا کی آواز پر وہ اپنے خیالات سے چونکی۔''

''کہاں گم ہو صدف......؟''

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا اس بارے میں سب کو ایک خاص مقصد کے لیے یہاں بلایا ہے۔'' صدف بھی ہمہ تن گوش ہوگئی۔

''میرا خیال ہے کہ اس گھر کو اور جو ساہی وال زمین ہے ہم فروخت کردیں۔'' صدف کی مارے صدمے کے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''بھئی دکھ تو مجھے بھی ہے پر کیا کریں؟ ہم سب باہر کے ملکوں میں رہتے ہیں زمین کی دیکھ بھال ڈھنگ سے کرنے والا کوئی ہے نہیں اور پھر ہمیں اس زمین کا فائدہ بھی کیا ہے۔ چچا کے بیٹے ساری آمدنی کھا جاتے ہیں۔ کچھ سالوں بعد تم لوگ دیکھنا وہ قبضہ بھی کرلیں گے اور یہ مکان آخر کب تک خالی پڑا رہے گا۔ بیکار میں چوکیدار کی تنخواہ بھرتے رہو۔ ہم میں سے شاید سوائے صدف کے کوئی بھی پاکستان میں سیٹل نہیں ہوگا اور اگر کبھی کوئی واپس آیا بھی تو وہ اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق گھر بنوالے گا۔''

سوائے صدف کے سب نے ہی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ صدف صدمے سے رونے لگ پڑی۔

''عجیب بے وقوف ہو تم بھی۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔'' اپیا نے مذاق اُڑایا۔

''آپ لوگوں کو کوئی دکھ نہیں ہوگا اماں ابا کی نشانی بیچ کر؟''

''پاگل ہو نری۔ اینٹ پتھر بھلا نشانیاں ہوا کرتی ہیں......؟''

وہ زچ ہوکر اُٹھ کر چلی گئی۔ ''ہے اللہ! کتنے مطمئن ہیں میرے بھائی بہن۔ دکھ کا ہلکا سا تاثر بھی نہیں ان کے چہروں پر۔ میں ہی کیوں ایسی ہوں۔ صدا کی ماضی پرست جھلی۔''

دوپہر کو سب سو گئے تو وہ باؤلوں کی طرح اوپر نیچے سارے گھر میں پھرتی رہی۔

یہ کمرہ بڑے بھیا کا تھا اور یہ ساتھ والا چھوٹے بھیا کا۔ ان کے سامنے اس کا اور اپیا کا کمرہ تھا اور ان کے ساتھ والا چھوٹے بھائیوں کا۔ نیچے ٹی وی لاؤنج سے داہنے ہاتھ پر اماں اور ابا کا کمرہ تھا۔

دونوں بھائیوں کی شادی کے بعد گھر میں رونق عروج پر تھی۔ اماں کی خوشی دیدنی تھی۔ ناشتہ کی میز پر جب سب کرسیاں بھر جاتیں تو اماں ابا سے فخریہ کہتیں

''دیکھا نا ماشاء اللہ کیسے ساری میز بھر گئی ہے۔ آپ تو کہا کرتے تھے اس خالی میز پر ٹیبل ٹینس کھیلا کرنا۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔''

شادی کے دو ڈھائی سال بعد دونوں بڑے بھائی امریکہ چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اپنی بیویوں کو بھی بلالیا۔ یوں اماں کی پوتے پوتیاں کھلانے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ جب وہ دکھی ہوتیں تو دونوں چھوٹے بھائی تسلی دیتے۔'' اماں اُداس

نہ ہوں ہم دونوں۔کے پورے ایک درجن بچے ہوں گے۔وہ سب آپ کی گود میں ہی کھیلیں گے۔'' دم بھر کو ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی۔ایسا بھی اپنے گھر سدھاریں۔اماں کو مزید چپ لگ گئی۔

پھر یوں ہوا کہ جیسے ہی چھوٹے دونوں بھائی تعلیم سے فارغ ہوئے مزید پڑھنے کے لیے وہ دونوں بھی باہر سدھار گئے۔ان کے جانے پر اماں کیا کیا نہیں روئیں۔ان دونوں نے ضد سے پیار سے اماں کو منا ہی لیا۔

''اماں! کیا آپ نہیں چاہتیں کہ ہمارا مستقبل بھی شاندار ہو۔یہاں پر اوّل تو نوکریاں ملتی کہاں ہیں؟ اگر مل بھی جائیں تو اس مہنگائی کے دور میں اتنی سی تنخواہ میں گزارہ کیسے ہوگا؟ ہم آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ہم وہاں سے اتنا کما کر بھیجیں گے کہ آپ اور ابا چین کی زندگی جی سکیں۔آپ نے ہمارے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔اب ہماری باری ہے۔''

''بیٹا! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔بس تم میری آنکھوں کے سامنے رہو۔ہم تھوڑے میں گزارہ کرلیں گے۔ویسے بھی اللہ نے ہمیں بہت دے رکھا ہے۔تم ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہو۔تمہارے معذور باپ کو اور مجھے صرف تم لوگوں کی ضرورت ہے۔ہمیں تمہارا روپیہ نہیں چاہیے۔ہمیں صرف تمہارا ساتھ چاہیے۔'' اماں کے آنسو موتیوں کی طرح گر رہے تھے۔

''اماں! پیاری اماں! آپ ہمارے راستے کی دیوار نہ بنیں۔ہم وعدہ کرتے ہیں تعلیم مکمل ہونے کے بعد چند سال وہاں لگا کر واپس لوٹ آئیں گے۔''

''زبیدہ! ضد نہ کرو۔انہیں ان کی خوشی جانے کی اجازت دے دو۔پرندوں کے بچے بھی اتنی دیر تک گھونسلے میں رہتے ہیں جب تک انہیں قوت پرواز نہیں ملتی۔اب یہ تمہارے پروں کے نیچے نہیں رہ سکتے۔انہیں اب اپنی اپنی زندگی جینے دو۔''

سال پہ سال گزرتے چلے گئے اور جانے والے پلٹ کر نہ آئے۔ہر سال ایک نیا بہانہ تیار ہوتا۔دونوں چھوٹے بھائیوں کی شادی کی اطلاع پر اماں اتنا روئیں کہ انہیں چپ کرانا مشکل ہوگیا۔وقت نے ان کے خواب ان کی آنکھوں سے نوچ کر کہیں پاتال کی گہرائیوں میں پھینک دیے تھے۔ان کا ہر سپنا پانی کی لہروں پہ بنا ریت کا محل ثابت ہوا۔

''آپ ٹھیک کہتے تھے بیکار میں نے ضد کر کے اتنا بڑا گھر بنوایا۔''

''دل چھوٹا نہ کرو۔ذرا وہ سیٹل ہو جائیں تو چھٹیوں میں ضرور گھر آیا کریں گے۔''

ابا انہیں لاکھ تسلیاں دیتے۔پر ان کے دل کی مرجھائی کلی پھر نہ کھل سکی۔ابا کے انتقال کے بعد تو بالکل باؤلی سی ہوگئی تھیں۔(بھائیوں میں سے کوئی بھی جنازے پر نہیں پہنچ سکا تھا) پہروں یا تو گم صم رہتیں یا پھر اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتیں۔ابا کی پہلی برسی پر سب بہن بھائی اکٹھے ہوئے تھے۔اماں بچوں کو دیکھ کر جیسے ابا کی وفات کا غم بھول سا گئی تھیں۔

مہینہ بھر وہ لوگ رہے۔کیسی رونق تھی اماں کے چہرے پر۔اماں کو یاد کر کے صدف کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔انگلی کی پور سے آنسو صاف کیے اور باہر لان میں آ گئی۔کتنی یادیں اور محبتیں اس گھر کے چپے چپے پر لپٹی ہوئی تھیں۔وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ یہاں پر اس نے سہانے میٹھے سپنے دیکھنے شروع کیے تھے۔اسی گھر میں اس کے دل نے دھڑکنا سیکھا تھا۔

اماں کو کتنا شوق تھا پھولوں اور پھلوں کا۔لان کے چاروں کونوں پر رات کی رانی، ہارسنگھار، لیونڈر اور موتیے کے مہکتے ہوئے پودے تھے۔کیاریوں میں ہر موسم کے پھول بہار دیتے۔ٹیوب روز کی خوشبو سے سارا گھر مہک اُٹھتا۔گرمیوں میں موتیے پر اتنے پھول آتے۔صدف روزانہ جھولیاں بھر بھر پھول اُتارتی اور ان کی لڑیاں پرو کر اماں کے جوڑے پر لپیٹ دیتی۔جو بچ جاتے وہ پانی کے گھڑوں کے گرد لپیٹ دیے جاتے۔سردیوں میں رات کی رانی مہکتی تو سارے گھر میں پاگل سی خوشبو اُڑتی پھرتی۔بیک یارڈ میں آم، کچنار، لیموں اور نہ جانے کون کون سے درخت لگا رکھے تھے۔

وہ بے مقصد لان میں گھومتی رہی۔سب پودے جھاڑ جھنکار بن چکے تھے۔مہندی کے پودے کے پاس کھڑے ہو کر اسے بے اختیار رونا آ گیا۔

''ہائے اماں! یہ پودا آپ نے کتنے شوق سے لگوایا تھا۔''

مالی نے انہیں کتنا منع کیا تھا۔''بی بی مہندی کا پودا نہ لگائیں.....''

''کیوں بھئی.....؟''

''سنا ہے مہندی کے پودے کے نیچے سانپ رہتا ہے۔''

''ارے جانے دو۔ایسے ہی باتیں بنی ہوئی ہیں۔تم کیا جانو تازہ پتیاں پیس کر لگائیں تو رنگ کتنا اچھا آتا ہے۔میری بہو بیٹیاں لگایا کریں گی۔'' کیا رنگ سا اُتر آیا تھا ان کے چہرے پر۔

''ہائے یہ جامن کا پیڑ۔اس کے تنے پر ابھی تک دو نام کھدے ہوئے تھے۔''صدف اور عدنان.....''وہ بے دھیانی میں ان ناموں پر انگلی پھیرتی رہی۔نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں سے دو موتی گرے اور گالوں پر لڑھکتے ہوئے مٹی میں رل گئے۔اسے لگا ابھی وہ باڑھ پھلانگ کر آئے گا اور کہے گا''او ہو صدف صاحبہ تشریف رکھتی ہیں۔''

''آپ کو کوئی اعتراض.....؟'' وہ اترا جاتی۔

''بھئی میں اعتراض کرنے والا کون.....؟ بس ذرا سارا چمن رنگ و بو سے مہک رہا تھا اور خوشبو نے خبر دی کہ تم آئی ہو۔''

آہ کیسے خوشیوں بھرے وہ دن تھے۔ گرمیوں کی بھی دوپہریں وہ اس باغ میں کھیلتے گزار دیتے۔ اماں ابا کے سونے کے بعد وہ سب، بہن بھائی سوائے بڑی اپیا اور بڑے بھائیوں کے چپکے سے دبے پاؤں ٹھنڈے کمروں سے نکل آتے۔ پڑوس کے بچے بھی آ جاتے اور خوب کھیلتے۔ کیریاں توڑ کر نمک مرچ لگا کر کھائی جاتیں۔ جھولا جھولتے، لکن میٹی کھیلتے۔

عدنان اور صدف تقریباً ہم عمر تھے۔ اس لیے ان دونوں میں خوب بنتی تھی۔ عدنان ذرا دبو قسم کا لڑکا تھا اور صدف تو پٹاخہ تھی۔ ایسی حاضر جواب کہ بڑوں بڑوں کو لاجواب کر دیتی۔ ہر بات کا گھڑا گھڑایا جواب اس کے پاس موجود تھا۔ سب شرارتوں کی سرغنہ، بولڈ اور نڈر۔ اونچے سے اونچے پیڑ پر منٹوں میں چڑھ جاتی۔ وہ درخت کی سب سے اونچی ڈال پر جھولتی ہوئی عدنان کو اوپر آنے کے لیے کہتی۔ وہ مارے خوف کے وہیں آنکھیں بند کیے کھڑا رہتا۔ ''بزدل'' وہ قہقہہ مار کر ہنستی اور بندر کی طرح اُچک کر ایک ڈال سے دوسری پر لٹک جاتی۔

چاندنی راتوں میں وہ پہروں آنکھ مچولی کھیلتے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ دن پر لگا کر اُڑ گئے۔ اپیا بیاہ کر اپنے گھر چلی گئیں۔ دونوں بڑے بھائی اور بھابیاں باہر چلے گئے۔ عدنان انجینئرنگ کے آخری سال اور وہ ایم اے فائنل میں پہنچ گئی۔ عدنان اور صدف کی ابھی بھی دوستی تھی لیکن اب وہ سب اتنے مصروف تھے کہ دنوں ملاقات نہ ہو پاتی۔ مگر نادیہ اور صدف چونکہ کلاس فیلو تھیں اس لیے وہ اکثر اکٹھے ہی ہوتیں۔

عدنان کا انجینئرنگ کا رزلٹ آیا تو اس نے باہر جانے کی تیاری کر لی۔ وہ سب کتنا اداس تھے۔ خاص طور پر صدف کیونکہ وہ گہرے دوست تھے۔ امریکہ سے اکثر اس کے کارڈ آتے رہتے۔ دو سال کے بعد وہ اپنی والدہ کی بیماری کا سن کر ملنے آیا تو پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ دبلے پتلے اور بقول صدف کے ٹیڑھی ٹانگوں اور مسکین شکل والے عدنان کی جگہ ایک خوبرو اور سمارٹ نوجوان میں ڈھل چکا تھا۔ صدف تو اسے دیکھ کر چیخ پڑی۔ ''ارے واہ! تم تو اچھے خاصے نکل آئے ہو۔''

وہ جھینپ گیا۔ سب نے بے ساختہ قہقہہ لگایا

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ پہلے تو لم ڈھینگ سے ہوا کرتے تھے۔''

عدنان کے واپس جانے سے پہلے رحیم چچا اور چچی صدف کے لیے پرپوزل لے کر آئے جو سب کے ساتھ ساتھ صدف کے لیے بھی باعث حیرانی تھا۔ مانا کہ وہ بچپن کے دوست اور ساتھی تھے پر ایسا تو ان کے بیچ کچھ نہیں تھا۔ صدف نے صاف انکار کر دیا۔

اماں سے اچھی خاصی ڈانٹ پڑی ''واہ نواب زادی کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ ارے گھر بیٹھے بٹھائے اتنا اچھا رشتہ مل رہا ہے۔ بچپن کے ساتھی ہو۔ تمہیں اور کیا چاہیے۔ رحیم بھائی اور بھابی سگے رشتے داروں سے بڑھ کر ہیں۔''

اس کے انکار کی وجہ سن کر سب بہت ہنسے ''لوگ سوچیں گے کہ میرا اور عدنان کا پہلے سے چکر چل رہا ہوگا۔''

''بے وقوف! ہمیں کیا لینا دینا لوگوں سے۔ ہمیں اور عدنان کے گھر والوں کو سب پتہ ہے۔ اور اگر تم ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہو تو کیا برائی ہے؟''

امی اپیا اور نادیہ نے اس کے خوب لتے لیے۔

عدنان کے واپس جانے سے پہلے منگنی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ادا کی گئی۔ منگنی کے بعد صدف عدنان سے ذرا کم بات چیت کرتی تھی۔ وہ پریشان تھا کہ صدف شاید ابھی بھی خوش نہیں ہے۔ کہیں اس کے انکار کی وجہ کچھ اور تو نہیں۔ جب صدف کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو اسے بہت غصہ آیا۔ شامل اعمال عدنان اسے لان میں اکیلا نظر آ گیا۔ صدف نے اس کی اچھی خاصی گوشمالی کی۔

''اب کیا میں اپنی منگنی پر بھنگڑا ڈالوں۔ چوبیس گھنٹے تمہاری طرح ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار بن کر پھروں۔''

عدنان بے ساختہ ہنس پڑا ''لمبے لمبے دانت مت نکالو۔ اتنے خوبصورت نہیں ہیں۔'' صدف چڑ کر بولی۔

''یہ ہوئی نا بات۔ اب تم پہلے والی صدف لگ رہی ہو۔ یار مجھے تمہارا یہی روپ تو پسند ہے۔ بولڈ اور جھگڑالو۔''

پھر وہ مزید دو سال کے لیے چلا گیا۔ اس کے خط، کارڈ اور ٹیلی فون آتے رہتے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تو اس کی آواز آتی ''تمہاری آواز سننا چاہتا تھا اور ایک عدد ڈانٹ۔ بہت دن ہوئے تم نے ڈانٹا نہیں تھا۔''

وہ جواباً ہنس کر کہتی ''بالکل پاگل ہو! چلو فون بند کرو اتنا بل بن جائے گا۔ فضول خرچیاں مت کیا کرو۔ چچا کی بڑی حق حلال کی کمائی ہے۔''

''محترمہ! اس کال کا بل میں تمہارے چچا کی کمائی سے ادا نہیں کروں گا یہ میں اپنی کمائی سے ادا کروں گا۔'' وہ ہنستا ہوا فون بند کر دیتا۔

پھر رفتہ رفتہ ان کے مابین فاصلہ بڑھنے لگا۔ اس کے خطوں اور کارڈوں میں کمی آنے لگی۔ فون بھی کم آنے لگے۔ اگر آتا بھی تو محسوس ہوتا جیسے اس کا دھیان کہیں اور ہے۔

وہ بہت دنوں کے بعد نادیہ کی طرف گئی تو اسے لگا جیسے وہ اور آنٹی بے حد روتی رہتی ہوں۔ اس کے پوچھنے پر نادیہ نے ٹال دیا۔ اسے دل میں برا لگا لیکن

وہ خاموش رہی کہ ہوگا کوئی ذاتی مسئلہ جو وہ بتانا نہیں چاہتیں۔ نادیہ دن بدن بہت عجیب سی ہوتی جا رہی تھی۔ خاموش اور کھوئی کھوئی سی رہتی۔ صدف محسوس کر رہی تھی جیسے اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ جو چپ نادیہ کو چچی کو لگی تھی وہی چپ اماں کو بھی لگ گئی۔ صدف کا دل بھی ہر دم پریشان رہنے لگا۔ بہت دنوں سے عدنان کی بھی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔

ایک دوپہر اس نے نادیہ کو گھیر لیا۔ اپنی قسم دے کر آخر وہ نادیہ سے سچ اُگلوانے میں کامیاب ہوگئی۔

''عدنان نے فون کیا تھا کہ وہ نہ تو ابھی واپس آنا چاہتا ہے اور نہ ہی شادی کرنا چاہتا ہے۔'' نادیہ نے روتے ہوئے بتایا۔

صدف نے غصے سے کھولتے ہوئے عدنان کو فون کیا ''تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ مجھے سچ سچ بتا دو یقیناً تمہارا کوئی چکر ہوگا......''

''کوئی چکر نہیں ہے۔ میں بس ابھی اپنے آپ کو شادی کے لیے تیار نہیں پاتا۔ مجھے ابھی اپنا کیریئر بنانا ہے۔ میں پاکستان واپس آ کر چند ہزار روپوں کی نوکری میں گزارہ نہیں کر سکتا۔''

''تمہیں کیریئر بنانے میں کتنے سال لگیں گے؟ دو، چار، دس کتنے سال؟'' صدف نے طنز کیا۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اسی لیے میں تمہیں پابند نہیں رکھنا چاہتا۔''

''بہت اچھا کیا تم نے بتا دیا۔ مہربانی تمہاری......'' تھوڑی دیر دونوں کے درمیان خاموشی تیرتی رہی۔

''اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں تمہاری محبت میں مری جا رہی ہوں۔ وہ تم تھے جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے میں نہیں۔'' اور اس نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ ان دنوں وہ کس قدر افسردہ اور دُکھی تھی محبت کے چھن جانے کے علاوہ اپنے ٹھکرائے جانے کی اذیت مارے ڈال رہی تھی۔ ''کیا میں اتنی بے مایہ تھی کہ عدنان نے اپنے کیریئر کی خاطر مجھے ٹھکرا دیا۔ اتنے سالوں کی دوستی تک کو وہ بھول گیا۔''

اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ عدنان کا حشر کر دے۔ بظاہر تو وہ یہ ظاہر کرتی تھی جیسے منگنی ٹوٹنے کا اسے کوئی غم نہیں ہے اور نہ ہی عدنان کی رتی بھر پروا ہے لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ اسے ہر چیز عدنان کی یاد دلاتی تھی۔ باغ میں جاتی تو چاندنی رات، موتیے کے پھول وہ کیسے جھولی بھر کر اس کے اوپر ڈالا کرتا تھا۔ بارش ہوتی تو اسے وہ بھیگی راتیں یاد آتیں۔ جب سب مل کر رات گئے تک تاش کھیلتے رہتے، بار بار چائے اور کافی پی جاتی۔ ایک روز پہلے دیکھی ہوئی فلم پر زور شور سے تبصرہ ہوتا۔ بیت بازی کی محفل جمتی۔ اب تو سب کچھ خواب لگتا تھا۔

ایک کہر آلود صبح رحیم انکل کی ڈیتھ ہو گئی۔ مرنے سے پہلے انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔ ''خبردار اگر کسی نے میرے مرنے پر عدنان کو بلایا وہ ہم سب کے لیے مر چکا ہے۔''

چچی پہروں صدف کو گلے لگا کر روتی رہتیں۔ اس کی اور نادیہ کی کچھ ہی عرصے میں شادی ہوگئی۔ شادی کے کچھ مہینوں بعد وہ میکے آئی تو پڑوس میں تالہ پڑا تھا۔ چچی نادیہ کے پاس چلی گئی تھیں۔

صدف اپنے گھر میں خوش تھی۔ پھول سے بچے جاںنثار قسم کا شوہر، بظاہر وہ بہت مطمئن اور خوش تھی۔ پر دل میں ایک پھانس سی گڑی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ عدنان کو کبھی یاد نہ کرے۔ وہ عمر کے اس دور سے تعلق رکھتا تھا جو گزر چکا تھا۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھنے کا فائدہ؟ مگر وہ مسلسل کسی نہ کسی بہانے یاد آتا رہا۔ اس کا خیال کسی آسیب کی طرح اس کا پیچھا کرتا ہی رہا۔ کیا وہ مجھے بھول چکا ہوگا؟ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ ان سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

صدف کی شادی پر اس کا آخری کارڈ ملا تھا۔ ''میں جانتا ہوں تم بہت پیاری لگ رہی ہوگی۔ خدا کرے تم سدا خوش رہو۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔''

صدف نے غصے سے کارڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے۔

ماربل کے بینچ پر بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں اور کمر تھک گئی تھی۔ وہ اُٹھنے کو تھی کہ آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ وہ بے یقینی سے سامنے دیکھا کی۔ تخیل کی اُڑان، نظروں کا دھوکہ یا واہمہ۔ باڑھ کے اس پار سے کوئی پھلانگ کر اس کی اور چلا آ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک کر منہ میں آ گیا۔ اس کے اردگرد تیز آندھیاں سی چلنے لگیں۔ آخر وہ لمحہ آن پہنچا جس کا اسے برسوں سے انتظار تھا لیکن اس وقت اچانک اسے سامنے پا کر اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اُٹھ کر کہیں بھاگ جائے۔ لیکن نہ جانے کون سی قوت نے اس کے پاؤں جکڑ رکھے تھے۔ صدف نے دل کڑا کر کے نظر بھر کر عدنان کو دیکھا وہ کافی بدل گیا تھا۔ اس کا سرخ و سفید رنگ جھلس کر تانبے جیسا ہو چکا تھا۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی۔

''کیسی ہو؟''

''اچھی ہوں۔''

''تم سے ملنے کی میں نے بہت دعائیں مانگی تھیں۔''

''کیوں......؟'' وہ تیوری چڑھا کر بولی۔

''تم بالکل بھی نہیں بدلی ہو۔ نہ مزاجاً اور نہ......'' عدنان نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''کیا مطلب......؟''

''میرا مطلب ہے اسی طرح ہو۔ وقت نے تم پر کوئی خاص اثرات نہیں چھوڑے۔''

''کتنا وقت گزر گیا۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد صدف نے بات کرنے کے لیے سرا ڈھونڈا۔

''ہاں...... جہت سے بیت گیا۔'' عدنان بلامقصد ہی اپنی عینک کے شیشے صاف کرنے لگا۔

عدنان نے اس کے شوہر اور بچوں کی خیریت دریافت کی جواباً اس نے بھی کی۔ عدنان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھران دونوں کے درمیان خاموشی کی چادر تن گئی۔ صدف جواس سے پوچھنا چاہتی تھی پوچھ نہیں پا رہی تھی۔ آج بھی اپنے ٹھکرائے جانے کی اذیت وہ بھولی نہیں تھی۔

''اس وقت تمہارا ملنا کسی معجزے سے کم نہیں۔'' وہ بے چینی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ آخر وہ ہمت کر کے بولا۔

''میں تمہارا گنہگار ہوں۔ میں برسوں سے تم سے معافی مانگنے کی حسرت دل میں لیے پھر رہا ہوں۔''

''معافی کیسی؟ جوآپ نے مناسب سمجھا کیا۔ جو وقت گزر گیا اب اسے دہرانے سے فائدہ؟''

وہ جانے کے لیے مڑی۔ وہ جو ہمیشہ عدنان کے ایک بار ملنے کی دعائیں مانگا کرتی تھی تاکہ اپنی بےعزتی کا بدلہ لے سکے۔ اس گھڑی اب اس کے دل میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ بدلے کی بھاؤنا...... نہ کچھ چھن جانے کا دکھ...... نہ کوئی احساس زیاں۔''

''پلیز صدف رکو......! میں جو کہنا چاہ رہا ہوں مجھے کہنے دو۔ پھر شاید زندگی میں موقع ملے نہ ملے۔ تم یقین کرو یا نہ کرو۔ میں نے زندگی میں جس لڑکی سے محبت کی ہے، جس کوٹوٹ کر چاہا ہے وہ صرف تم ہو۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی اور نظروں میں طنز کی گہری کاٹ تھی۔

عدنان نے اپنی بات جاری رکھی ''میں نے تم سے دور جانے کا کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جولین میری کلاس فیلو اور بڑی اچھی دوست تھی۔ میں اکثر اس کے ساتھ تمہاری باتیں کیا کرتا تھا اور تمہارے لیے شاپنگ بھی اسی کے ساتھ کرتا تھا۔

وہ عام امریکن لڑکیوں سے مختلف تھی۔ سلجھی ہوئی، سادہ مزاج اور نیک اطوار۔ آخری سمیسٹر میں دو ماہ رہ گئے تھے۔ دوسرے ممالک سے آئے ہوئے ہم سب لوگ اپنے اپنے وطن لوٹنے کے خیال سے بہت خوش تھے۔

انہی دنوں ہماری رمضان عید آ گئی۔ میں نے سوچا چلو اسی بہانے اکٹھے ہوتے ہیں۔ امتحانوں کے بعد تو سب اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ جائیں گے۔ اس رات میں نے کچھ دوستوں کو ڈنر پر بلایا۔ رات گئے تک خوب ہنگامہ رہا۔ پھر سب لوگ چلے گئے میرے منع کرنے کے باوجود جولین رُکی ہوئی تھی۔

''اپنے کمرے کی حالت دیکھو جیسے بھوت ناچ کر گئے ہوں۔ اکیلے سب کیسے کرو گے۔ تم کمرہ سیٹ کرلو میں برتن دھو دیتی ہوں''

''رات زیادہ ہو جائے گی۔''

''تم مجھے چھوڑ آنا......''

اے کاش وہ رات میری زندگی میں کبھی نہ آئی ہوتی۔ وہ رات جس نے میری ساری زندگی پر سیاہی پھیر دی۔ نہ جانے کب ہم دونوں کسی کمزور لمحے کی زد میں آ گئے۔ اس ایک لمحے نے ہم دونوں کو اپنی نظروں میں گرا دیا۔ ہم جو اتنے اچھے دوست تھے ایک دوسرے سے کترانے لگے۔ میں اپنے آپ سے اور جولین سے شرمسار تھا۔ وہ کیا سوچ رہی ہوگی میرے بارے میں کہ میں کتنا گرا ہوا انسان ہوں اور میں تمہارا سامنا کیسے کروں گا؟ اتنے سالوں کی میری شرافت اور پارسائی مٹی میں مل گئی تھی۔

ایک دن جولین پریشان سی آئی اور اس نے میرے سر پر بم پھوڑ دیا۔ پھر میں نے اس سے شادی کر لی۔ ہماری شادی ایک سال چلی۔ بچہ بھی پری میچور پیدا ہوا جو دنیا میں چند سانسیں لے سکا۔

بارہا میں نے چاہا کہ میں واپس آ جاؤں اور سب سے معافی مانگ لوں۔ مجھے ڈر تھا کہ تم مجھے کبھی معاف نہیں کرو گی اور پھر اتنی دیر ہوگئی کہ واپسی کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔ کاش میں لوٹ آتا۔ وقت بیت جائے تو انسان کے پاس پچھتاوؤں کے سوا کچھ بچتا ہی نہیں۔''

اتنے سال بیتنے کے باوجود دوسری لڑکی کا سن کر اس کے دل میں کچھ چھن سے ٹوٹ سا گیا۔

''آپ یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہیں؟ اس سارے قصے سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ ایک چھوڑی ہوگی تو کئی اور مل گئی ہوں گی۔'' وہ جل کر بولی۔

''صدف! میرا یقین کرو وہ میری پہلی اور آخری بھول تھی جس کی سزا میں آج تک بھگت رہا ہوں۔''

''مجھے اس جھوٹی کہانی پر رتی بھر اعتبار نہیں۔''

پھر وہ جانے کے لیے اُٹھا۔ وہ غیر ارادی طور پر اسے باڑھ کے کنارے تک چھوڑنے چلی آئی۔

''اندر نہیں آئیں گے۔ سب آئے ہوئے ہیں۔''

''کس منہ سے جاؤں؟''

''اسی منہ سے جیسا اب ہو چکا ہے۔'' وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

باڑھ پھلانگنے سے پہلے عدنان نے اسے مڑ کر دیکھا۔ اس آخری نظر میں جانے کیا کچھ تھا کہ وہ اسے خدا حافظ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے دو موتی گرے۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں سے انہیں صاف کیا۔ ایک لمبا سانس لیا۔

پھر وہ انتہائی پرسکون اور ہلکی پھلکی اندر کی طرف چل دی۔

# سفید بالوں والوں کا ملک

عامر بن علی/جاپان

جاپان سفید بالوں والے لوگوں کا ملک بنتا جا رہا ہے۔اس بات سے قطع نظر کہ آبادی کی اکثریت خضاب کا استعمال کرتی ہے،مگر پھر بھی ضعیف العمری کے اپنے تقاضے اور مظاہر ہوتے ہیں۔تازہ ترین مردم شماری کے مطابق جاپان کی مجموعی قومی آبادی میں گزشتہ پانچ برس کے دوران دس لاکھ افراد کی کمی ہوگئی ہے۔اس خبر نے ملک کے سنجیدہ حلقوں میں تشویش کی لہر دوڑا دی ہے،چونکہ یہ زمانہ امن میں آبادی میں کمی کا رجحان ریکارڈ کیا گیا ہے۔ریاست کو گزشتہ پانچ برس میں نہ تو کوئی جنگ درپیش تھی اور چند سال پہلے آنے والے زلزلے وسیلاب میں ہلاک ہونے والے کچھ ہزار افراد کو اگر نظرانداز کر دیا جائے تو کوئی بڑی قدرتی آفت بھی آبادی میں کمی کا سبب نہیں بنی ہے۔شہریوں کو جدید طبی سہولیات کی باآسانی فراہمی اور صحت کے شعبے میں ہونے والی ترقی کے سبب اوسط عمر بڑھی ہے،کم نہیں ہوئی ہے۔سرکاری اعداد و شمار پر غور کریں تو تمام تر قدرتی آفات و ناگہانی واقعات کے باوجود ملک کے باشندوں کے زندہ رہنے کے امکانات میں مسلسل اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔عہد ساز سخن طراز ابن انشاء کا یہ قول اپنی جگہ معتبر سہی کہ ”جھوٹ کی تین اقسام ہوتی ہیں،اول جھوٹ،دوم سفید جھوٹ اور سوم سرکاری اعداد و شمار، جھوٹ کی قسم کے طور پر بیان کی گئی ہے۔یہاں صورت حال بالکل برعکس ہے۔سرکاری اعداد و شمار اور اطلاعات کو عوامی سطح پر زیادہ معتبر مانا جاتا ہے،اور حقیقتاً وہ زیادہ قابل اعتماد ہوتے بھی ہیں۔

آبادی میں کمی کی سب سے اہم اور کھلی وجہ تو کم شرح پیدائش ہی ہے۔پانچ سال پہلے کی گئی مردم شماری کے مطابق بارہ کروڑ تہتر لاکھ افراد جاپان میں زندگی گزار رہے تھے،جبکہ اس ماہ شائع ہونے والے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ایک ملین افراد کی کمی کے بعد،اب اس ملک کے باسیوں کی تعداد بارہ کروڑ چونسٹھ لاکھ کے قریب ہے۔آبادی کے لحاظ سے جاپان اب بھی دنیا کا گیارھواں بڑا ملک ہے اور اس عالم رنگ وبو میں سانس لینے والے انسانوں کی کل تعداد میں سے قریباً دو فیصد یہاں آباد ہیں۔تشویشناک بات یہ ہے کہ اگر آبادی میں کمی کا یہی تناسب جاری رہا تو اقوام متحدہ کے تخمینوں کے مطابق 2050ء تک جاپان کی آبادی محض 10 کروڑ نفوس تک محدود ہو جائے گی۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ 1955ء میں اس ملک کی آبادی 9 کروڑ افراد پر مشتمل تھی۔

کم شرح پیدائش کی وجوہات پر غور کریں تو ہمیں گرتی ہوئی آبادی کے مسئلے کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔میرے خیال میں اس کی سب سے اہم وجہ تو مہنگائی ہے۔پچھلی دو دہائیوں کا ریکارڈ اٹھا کر دیکھ لیں،ہر سال دنیا کے مہنگے ترین دس شہروں میں جاپان کے دو تین شہر شامل ہوں گے۔ٹوکیو اور اوساکا تو عموماً اس فہرست کے مہنگے ترین پانچ شہروں میں شامل رہے ہیں۔ایسے مہنگے ملک میں بچے پالنا یقیناً بہت مہنگا ہے،اس لئے لوگ ایک دو بچوں کے بعد مہنگائی کے خوف کا اکثر شکار ہو جاتے ہیں۔ملک میں قائم مثالی امن و امان اور جان و مال کا تحفظ جہاں بہت بڑی نعمت ہے،وہیں کم شرح پیدائش کی وجہ بھی ہے۔عالمی طور پر یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ جنگ زدہ علاقوں اور جنگ کے دوران شرح پیدائش میں اضافہ ہوتا ہے۔آپ فلسطین اور افغانستان کی تازہ مثالیں ہی دیکھ لیں،اتنی بڑی مقدار میں جنگ کی وجہ سے ان علاقوں سے ہجرت ہوئی مگر آبادی میں کمی کی بجائے مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔عدم تحفظ کا احساس شرح پیدائش میں اضافے کا سبب ہے اور تحفظ اس شرح میں کمی کا باعث بنتا ہے۔

بڑے شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی،بہتر مستقبل کی تلاش میں چھوٹے قصبوں اور دیہات سے لوگ ترک سکونت کر کے شہروں میں منتقل ہو رہے ہیں۔جاپان کی کل آبادی کا چھ فیصد اب دیہات میں زندگی گزار رہا ہے،جبکہ 94 فیصد لوگ شہروں کی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔بڑے شہروں میں زندگی کی سہولیات یقیناً یہاں بھی زیادہ ہیں مگر زندگی زیادہ مصروف اور مہنگی بھی ہے،نیز شہروں میں رہائش گاہوں کا عمومی سائز اتنا چھوٹا اور مختصر سا ہے کہ اس میں بڑا کنبہ سمانا تو ممکن ہی نہیں ہے۔شہری زندگی اور رہائش گاہوں کا رقبہ بھی آبادی میں کمی کا اہم سبب ہے۔

میرا مشاہدہ ہے کہ کوئی بھی ملک اور معاشرہ جتنا زیادہ مذہبی ہوگا اس میں آبادی میں اضافے کی

رفتار بھی اتنی زیادہ تیز ہوگی۔ یورپ، روس اور چین مذہب سے بیگانگی کی بڑی مثالیں شمار کی جاتی ہیں، اور ان میں آبادی کے بڑھنے کی شرح بھی بہت ہی کم ہے۔ غالباً توکل، ایثار اور صلہ رحمی خالصتاً مذہبی معاشرے سے منسوب چیزیں ہیں، جیسے جیسے مذہب سے دور ہٹتے جائیں، یہ دوسرے لوگوں پر احسان اور قربانی کے جذبات بھی ماند پڑتے جاتے ہیں، ان کی جگہ خودغرضی لے لیتی ہے۔ حضور پاک کا بڑا ہی خوبصورت فرمان ہے، جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ''جو کھانا ایک شخص کا پیٹ بھر سکتا ہے، وہ دو افراد کی شکم پروری کے لئے بھی کافی ہے''۔ اگر کوئی مجھ سے جاپانیوں کی مذہبی عبادات اور رجحانات کے بارے میں پوچھے تو یہ پریشان کن سوال ہوگا۔ اس معاشرے میں روحانیت کے اثرات تو بہت گہرے ہیں مگر مذہب اور مذہبیت سے یہاں کے لوگ کافی دور ہیں۔ گرتی ہوئی آبادی کی وجہ یہ بھی ہے کہ معاشرہ مذہب سے دور ہوتا جارہا ہے۔ سو سال سے زیادہ عمر کے حامل افراد کی سب سے زیادہ تعداد اسی ملک میں ہے۔ کم عمر اور زیادہ توانا لوگ محنت کی منڈی میں نسبتاً کم ہوتے جارہے ہیں۔ ملکی باشندوں کی اس وقت اوسط عمر 47 سال ہے۔

آبادی میں کمی کے رجحان اور اس کے اثرات کو سب سے نمایاں طور پر زرعی شعبے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ملکی زراعت کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس شعبے سے منسلک افراد کی تعداد بیس لاکھ سے بھی نیچے چلی گئی ہے۔ یوں تو کئی عشروں سے جاپان میں زراعت کا شعبہ بوڑھے لوگوں کے ہاتھ میں ہے، مگر وزارت زراعت کے مطابق اتنے شدید بوڑھے تو کسان بھی نہ تھے۔ یعنی 67 فیصد کسانوں کی عمر اب 67 برس سے بھی زیادہ ہے۔ ملک میں مجموعی طور پر زیر کاشت رقبہ مسلسل کم ہوتا جارہا ہے۔ گزشتہ پانچ سالوں میں زراعت سے روزی، روٹی کمانے اور اس شعبے پر زندگی کا انحصار کرنے والے افراد کی تعداد میں چودہ فیصد کمی ہوئی ہے۔ اب زرعی شعبے سے متعلق افراد کی تعداد محض سترہ لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔ باقی شعبہ ہائے زندگی میں بھی گھٹتی ہوئی آبادی کے اثرات محسوس کئے جارہے ہیں، گرچہ زرعی شعبے میں یہ زیادہ شدید ہیں۔ پاکستان میں خاندانی منصوبہ بندی اور آبادی کے کنٹرول پر تو بات ہوتی ہے مگر یہ نقطہ نظر سامنے نہیں آیا کہ بڑی آبادی، بڑی افرادی قوت کا مظہر اور ترقی کا زینہ بھی ہے۔ ہمارے ملک کے وسائل کے مطابق یقیناً بڑھتی ہوئی آبادی پر کنٹرول ضروری ہے مگر جاپان میں معاملہ الٹ ہے، گرتی ہوئی آبادی مسئلہ بنی ہوئی ہے۔

❖❖❖


**مبارک باد**

پرنسپل پی آر لیڈی گریفن گرلز ہائی اسکول کی میڈم

**ڈاکٹر نسرین علی اعوان**

اور ان کے اہل خانہ کو
حج کی سعادت حاصل کرنے پر
دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد

منجانب: سمعیہ احسن گل


## سلام

جلتے خیام صبر کی تصویر غم، دھواں
بیمار شام قافلہ زنجیر غم، دھواں

شامل مرا بھی نام بہتر میں ہو کبھی
مولا مری بھی کیجیے تقدیر غم، دھواں

ماتم پکار شام کا رستہ طویل تر
سینہ غبار خون کی تاثیر غم، دھواں

اکبر تمہارے سینے میں برچھی گڑی ہوئی
اصغر تمہارے حلق میں اک تیر غم، دھواں

آنکھوں میں شہر پیاس کا آباد کیجیے
سینے پہ کیجیے مرے تحریر غم، دھواں

باقی چراغ جلتے ہیں آنکھوں کے تیل سے
ملتی ہے ایسے خواب کی تعبیر غم، دھواں

اسد علی باقی/لاہور


بہ یاد: سید قاسم محمود

Book Digest
بک ڈائجسٹ لاہور

فروغ ادب کے لیے وقف

مدیر اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر انتظامی: اظہر سلیم مجوکہ

براہ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری، نثر) کمپوز کروا کے ''ان پیج'' میں ای میل کر دیا کریں
bookdigest@hotmail.com

آپ اپنے مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ رسالے کے حصول کے لیے سالانہ زر تعاون مبلغ -/1000 روپے اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر بنام مظہر سلیم مجوکہ مدیر اعلیٰ ماہنامہ بک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور کو ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔

برائے خط و کتابت / ترسیل زر / رابطہ
بک ڈائجسٹ
کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
0333-4377794 - 042-37322996

# پہچان

ڈاکٹر سلمان عبداللہ ڈار/گوجرانوالہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر میں نے خود کو پہچان لیا تو اک نہ اک دن میں اپنے رب کو بھی پہچاننے میں کامیاب ہو جاؤں گا کہ میں اس کی قدرتوں کا مظہر بھی ہوں اور شہکار بھی بلکہ یوں سمجھیں مجھے اس نے ایک جہانِ صغیر کے طور پر بنایا یعنی میرے ارد گرد جو جہان کبیر پھیلا ہوا ہے میں اس کی چھوٹی سی تصویر ہوں مثلاً

* میرے بدن پر اونچی نیچی جلد جہان کبیر میں موجود سطح مرتفع اور پوٹھوہار جیسے خطوں کی مانند ہے۔
* میرے جسم پر موجود ہموار جلد میدانوں کی طرح ہے
* جلد پر اونچے نیچے بال جنگلوں اور جھاڑ جھنکاڑ جھاڑیوں کی مانند ہیں
* شریانیں اور وریدی جسے باہر والے بڑے جہان میں دریاؤں نہروں اور ندی نالوں سے مشابہہ ہیں
* جس طرح زمین کی تہیں ہیں اس طرح میری کھال اور گوشت کی بھی تہہ در تہہ اک ایسی تصویر بنتی ہے جو زمین کی تہہ سے بہت ملتی جلتی ہے۔

اس جہاں صغیر اور کبیر کو بنانے والی ایک ذات ہے۔ اسی سوچ کو آگے بڑھا کر صوفیاء کے ایک گروہ نے وحدت الوجود کا سلسلہ بنایا یعنی وہ کہتے ہیں کہ اللہ کل ہے اور انسان جزو ہے یہ جزو کل سے ملنے کے لئے بے تاب ہے اب موت ہی ایسا دروازہ ہے۔ جس سے گزر کر ایسا ہو سکتا ہے۔ وحدت الوجود کا مسلک صحیح ہے یا نہیں یہ ہمارا موضوع نہیں مگر رب کی پہچان اور تعلق کے حوالے سے اس کا ذکر ضروری تھا صوفیا کا یہ گروہ سمجھتا ہے کہ رب ظاہر ہونا چاہتا تھا یوں تو یہ مرغزار کوھسار اور پوری کائنات یا کائناتیں اس کی ذات ہی کا پرتو ہیں مگر جیسے کہا گیا کہ

ارض وسما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ جہاں تو سما سکے

تو رب نے اپنا اظہار انسان کی شکل میں کیا کہ وہ قدرت کا عظیم شاہ کار تو ہے ہی مگر یہ ساری کائنات صرف ایک اللہ ہی کی ذات پر مشتمل ہے راقم کے ایک دوست پنجابی زبان کے ایک معروف شعر کے ذریعے اس مسلک کی ترغیب دیا کرتے اور کہتے

ایس عشق نے رب قادر نوں
انسان بنا کے چھڈ یا اے

ترجمہ: اللہ کے سچے عشق نے جو وہ انسان سے کرتا تھا اسی عشق نے قادر مطلق کو آخر کار انسان کا روپ دیا۔ راقم کی رائے میں رب کریم اپنے علم کی حد تک ہر جگہ موجود ہیں اور ذات کی حد تک انہیں عرش پر ماننا چاہیے اگر رب کو ہر جگہ مانیں تو پھر دو مسائل کا سامنا ہو گا اول یہ کہ ہر جگہ پاکیزہ تو نہیں ہوتی دوم یہ کہ اگر ایسا مان لیں تو پھر رب کی پہچان کیسے ہو کہ حقیقت اشیاء یعنی چیزوں کے وجود کی تشریح ناممکن ہو جائے گی۔

دراصل انسان کا دل آئینہ ہے اگر وہ معصیت سے پاک ہو گا تو معرفت کا انعکاس اس میں سے بہت ہی اچھا ہو گا۔ اور عاشق صادق اپنے رب کو جان بھی لے گا اور پہچان بھی لے گا مگر ہم میں سے آخر کتنے ہو نگے جو اس بات پر یا اپنے دل والے آئینے کی صفائی پر غور کرتے ہیں۔

آیئے ذرا جائزہ لیں رب کو پہچاننے والے کون ہوتے ہیں یا کیسے ہوتے۔ کن باتوں سے رب کی پہچان ہوتی ہے اور کن باتوں سے لوگ اس پہچان سے دور ہوتے جاتے ہیں

* رب کریم کو علم والے پہچانیں گے جاہل نہیں۔ بس رب کرم کرے بندہ ان پڑھ ہو تو بھی خیر ہے جاہل نہ ہو کہ پڑھے لکھے جُہلا رب سے دور چلے جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی دور لے جاتے ہیں اسی لیئے ہمارے بزرگ کہتے ہیں بے علمی سے بدعلمی زیادہ خطرناک ہے
* واسطے اور راستے سے رب کی پہچان ہو گی جو کہ سب سے اچھی طرح انبیاءؑ بتا سکتے ہیں دکھا سکتے ہیں اور ہمارے اندر کی تعمیر کر سکتے ہیں اندر کو منہدم ہونے سے بچا بھی سکتے ہیں۔ یوں یہ احسن طریقے سے رب کی پہچان کروا گئے مثال کے طور پر اصحاب صفہ جو کہ تقریباً 70 کی تعداد میں تھے مسجد نبوی میں رہتے ارشادات عالیہ سنتے ان کے ایمان اور یقین پہاڑوں جیسے تھے یعنی پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتا تھا ان کا یقین کامل نہیں! اصحاب صفہ میں سے سب سے زیادہ معروف حضرت ابوھریرہ ہوئے کئی کئی روز کا ناقہ ہوتا تھا۔ بھوک کی وجہ سے آدھی سے زیادہ صف زمین پر گر پڑتی تھی۔ مگر رب کو پہچان گئے تھے پھر یہی ابوھریرہ بصرہ کے گورنر بنے خود سے فرمایا کرتے۔

تو وہی ہے ناں جو کئی کئی روز بھوکا رہتا تھا۔ بھوک کی شدت سے گرتا تو بعض صحابہ پاؤں سے گردن دباتے کی شاید جنون ہو اب تو ریشم کے کپڑے

سے ناک صاف کرتا ہے۔

رب کریم کو پہچان لینے والے انہی مفلوک الحال صحابہ کرام نے تاج سردارا پنے پاؤں تلے کچل ڈالا۔ روم اور فارس جو اس زمانے کے روس اور امریکہ جیسے ممالک تھے ان کے سامنے سرنگوں ہو گئے اب ان صحابہ کرام نے رب کی پہچان والے راستے اور واسطے کا سرکار دو عالم ﷺ کی محفل میں پتہ چلا لیا تھا۔ اسی لیئے وہ جزیرہ عرب سے نکل کر براعظم یورپ میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے کھیتی باڑی کی نہ تجارت صنعت و حرفت کا علم حاصل کیا نہ ہی دوسرے فنون سیکھے مگر رب سے تعلق بنالیا۔

* جہاں تعلق ہوگا وہیں تاثیر ہوگی جہاں تاثیر ہوگی وہیں پہچان ہوگی رب سے تعلق دفتروں دکانوں مارکیٹوں اور شہروں کے اندر ہونے والی بے دینی سے ٹوٹا اب گھر میں ساٹھ انچ کی ماڈرن ایل ای ڈی کے سامنے باپ بیٹی بیوی اور بہن بیٹھ کر عریاں فلمیں اور رقص و سرور کی محفلیں دیکھیں تو تعلق کیسے بنے گا اب اللہ والوں کے پاس بیٹھیں گے تو تعلق بنے گا پھر پہچان کی راہیں کھلیں گی۔

* گاڑی سڑک پر خراب ہو جاتی ہے مگر سڑک پر پھر ٹھیک نہیں ہو سکتی اسے ورکشاپ لے جانا پڑتا ہے یا اس کی مثال یوں ہے کہ ایک شخص گھر کے صوفے اور بیڈ الٹ پلٹ رہا تھا چیزیں ادھر ادھر کر کے بار بار دیکھ رہا تھا کسی نے پوچھا کیا کر رہے ہو۔

تو پریشانی میں بولا، میرے پاس اک قیمتی موتی تھا اچانک کھو گیا اسے تلاش کر رہا ہوں۔

بھائی موتی کہاں گم ہوا تھا۔

جی وہ تو بازار میں گم ہوا تھا،

،،پھر یہاں کیوں تلاش کر رہے ہو،،

دراصل وہاں رش بہت تھا کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہ تھی اس لیئے سوچا جہاں آسانی ہے وہاں تلاش کر رہا ہوں۔

اب اسی ماحول میں رب کیسے ملے گا۔ رب تو مسجد ماحول میں ملے گا۔ اللہ والوں کے ہاں ملے گا۔

* مسلمان کی جس آنکھ میں حیا کا بسیرا تھا۔ وہاں بے حیائی نے جگہ بنالی جیسے آنکھ میں موتیا اتر آتا ہے تو نظر آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جاتی ہے اب تو آنکھوں میں بے حیائی بدنظری اور بدکاری ایسی اتری کہ ایمانی نظر ہی دھندلا گئی بندہ بھی کیا کرے گھر میں رہے یا باہر بازار میں نکلے تو بدمعاشی کانوں میں اترتی ہے بدکاری آنکھوں کے راستے دل میں اترتی ہے۔ عمومی معاشرہ ایسا ہو چکا ہے کہ اب تو خطاؤں کا نام ثواب رکھ دیا گیا ہے۔ عزت کا نام ذلت خرد کا نام جنوں اور جنوں کا خرد رکھ دیا تو پھر رب کی طاقتوں اور قدرتوں کی سمجھ کیسے آئے گی۔

* کم ناپنے کم تولنے والا دوکاندار، ملاوٹ کرنے والا تاجر مریض کی جیب پر نظر رکھنے والا ڈاکٹر بھاری فیس لے کر بے گناہ کو سزا دلوانے والا وکیل پیٹ کی خاطر اصلی دین نہ بتانے والا عالم دین اور فرقہ واریت کو ہوا دینے والا خطیب کرپٹ بیوروکریٹ اور روپے کے ناجائز اثاثے بنانے والا سیاستدان کیسے اپنے رب کو پہچانے گا۔

* بعض اوقات گراوٹ غفلت یا گناہ انفرادی ہوتا ہے چھپ کر توبہ کر لی جائے تو مہربان مالک اتنا سخی ہے کہ معاف کر دیتا ہے یا علم میں کوتاہی کی وجہ سے غلطی ہو گئی تو وہ بھی قابل معافی ہے عمل میں کمزوری رہ گئی تو وہ بھی معاف ہو سکتی ہے مگر علم میں تحریف رب معاف نہیں کرتا مثلاً نصرانیت نے نبی کی تعلیم ہی بدل دی عیسائیت نے حضرت عیسیٰؑ کی توحید والی تعلیم اور علم کی جگہ کہا کہ چونکہ رب کنواری مریم میں حلول کر گیا تھا اس لیئے مریم حضرت عیسیٰؑ اور رب ایک ہی ہیں تثلیث کا عقیدہ گھڑ لیا یعنی اصلی علم ہی کو بدل دیا انفرادی غلطی معاف ہو سکتی ہے عمل کی کج روی بھی معاف ہو سکتی ہے مگر بدعلمی نہیں اور پھر جب یہ علمی غلطی من حیث القوم ہو تو پھر معاذ اللہ عذاب آیا کرتے ہیں اجتماعی غلطیوں کی وجہ سے پوری قوم رب کی پہچان کھو بیٹھتی ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اب ایسا نہیں ہوگا کہ رب کریم قوموں کو بندر اور خنزیر بنائیں فرشتے لوگوں کی بستیاں الٹا دیں بلکہ اب پریشانی کا عذاب پوری قوم پر آئے گا اور آتا ہے کہ جسے دیکھو افراتفری میں ہے رنج والم ہیں کہ تھمنے کا نام بھی نہیں لے رہے بدعنوان حکمران ملکوں اور قوموں پر مسلط کر دیئے جاتے ہیں۔ مندرجہ بالا سطور میں عرض کیا گیا کہ انسان کا جسم جہاں صغیر ہے تو آدمی اپنی ہستی سے اپنے رب کو پہچان سکتا ہے اسی طرح اپنی صفات سے مالک حقیقی کی صفات کو جان سکتا ہے یعنی میں یہ سوچوں کہ میرے اعضاء پر جتنا اور جس قدر مجھے اختیار ہے میرے رب کو مجھ پر اس سے کہیں زیادہ اختیار ہے تو مجھے اپنے مالک کو پہچاننا آسان ہوگا مجھے جس احسن تقویم کی صورت میں جس نے پیدا کیا وہ خود کس قدر حسین ہوگا میں خود بخود پیدا نہیں ہوا جس ہستی نے مجھے نیستی سے وجود بخشا وہ کتنی قدرتوں والا

دگا میں بذات خودتو اپنے جسم و جاں کا اک انچ بھی پیدا کرنے سے قاصر ہوں پھر میرے اندر اس ذات نے کیسے کیسے سسٹم پیدا کر دیئے کیسے نظام بنا دیئے نظامِ تنفس، نظامِ ہضم اعصابی نظام اور نہ جانے کیا کیا جسے ابھی سائنس نے دریافت ہی نہیں کیا تو وہ خود جو کارساز ہے کیسا ہوگا اور کیسی حکمت والا ہوگا۔

جذب و شوق اگر رخصت ہو گیا تو پھر زندگی میں کچھ بھی نہیں بچا شوق ہی پہچان کرواتا ہے کہ رب تو کسی سے بھی کبھی بھی بدظن نہیں ہوتا ہماری چاہ ہی میں کمی بھی رہ جاتی ہے کوتاہی بھی ہو جاتی ہے جو آنکھ دل کی رفیق نہیں جسے کوتاہی پر ندامت بھی نہیں وہ اپنے مالک کو کیسے پہچانے گی؟ کہ سچی آنکھ ہی کو سچ نظر آتا ہے جھوٹی آنکھ میں تو کوئی جذبہ ہوتا ہے نہ شوق! سب سے بڑا رشتہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ہے اور اسے دل کی آنکھ ہی محسوس کر سکتی ہے۔ دل کے سمندر پر اللہ کے غیر کی کوئی جمی ہوئی ہے جذب وشوق کہاں سے آئے گا یہ زبردستی پیدا تو نہیں کیا جا سکتا زندگی کی راہ پر یہی تو اک عصا ہے یہ عصا لڑکھڑا گیا تو بات لڑکھڑائے گی اگر بات لڑکھڑا گئی تو یوں سمجھیے شخصیت ہی لڑکھڑا گئی تو پہچان میں رخنہ یقینی طور پر آئے گا۔ کیونکہ یہ کائی اگر چھٹ جائے تو ابدیت کو اس میں رچ بس جانے کی جگہ ملے گی۔ ابدیت کو بس جانے کے لیئے مال یا عہدے کی ضرورت نہیں کہ یہ تو حجاب سا بنے گا۔ بلکہ وہ علم جو تکبر اور غرور پیدا کرے نخوت کا اظہار کرے وہ بھی حجاب بنے گا اس دنیا میں رہتے ہوئے بلاوا آنے سے پہلے ان حجابات کو دور تو کرنا ہوگا۔ اٹھتے ہیں جب حجاب آخر تب پہچان کو جلا بخشی جاتی ہے پھر القابات خطابات احکامات الزامات بات بے بات سب کچھ مات ہوجاتا ہے۔

جسے پہچان کا ایک ذرہ بھی نصیب ہو گیا اس پر اس بے پایاں اور خوبصورت نعمت کا شکر واجب ہوا شکر ادا ہوا تو یہ نعمت مالک اور بڑھا دے گا۔ نہ ادا ہوا تو نسیاً منسیا بھی ہو سکتے وہ شیوخ اور معروف علمائے کرام کچھ ایسے بھی تو تھے کہ جن کی صرف ایک جھلک دیکھنے کو لاکھوں کا مجمع امڈ آتا تھا مگر آج دیندار حلقوں میں ان کے نام کا ذکر کرنے والا بھی کوئی نہیں اھل اللہ لوگوں میں ان کا نشان باقی نہ رہا اب اگر دین ہی کو دنیا بنانے اور کمانے پر لگا دیا تو جب قبر میں پوچھا جائے گا۔

تمہارا دین کونسا ہے؟

تو کیا جواب بن پڑے گا کہ دین کو تو روپیہ اور جاہ وحشمت کمانے کا ذریعہ بنایا ہوا تھا اب یہ ایک ایسا غلط ارادہ تھا کہ اس میں کامیاب ہونے والے بھی ہمیشہ ہمیشہ کی نہ ختم ہونے والی زندگی کے لحاظ سے ناکام ہیں (اور اس کا الٹ صحیح بھی ہے اور بہت کچھ دلانے والا بھی) صحیح ارادے میں ناکام بھی ہو گئے تو بظاہر

ع ہارے بھی تو بازی مات نہیں

رب سے دور لے جانے والے علم کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں ہوا اب خود ہی جاننا ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کو جسے وہ اپنی پہچان کروانا چاہے اس پر کرم کرنے کا ارادہ کرے تو اسے وہ علم عطا کر دے جو رب سے دوستی کرواتا ہے یہ علم عمومی دستوری سکھلائی والا علم نہیں ہوتا بس یہ رب کی خاص عطا ہی سے ملتا ہے ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کی نعمت تو میسر نہیں ہوا کرتی یہ تو خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را والی بات ہے نصیبوں سے ملتی ہے بس اسی کی چاہ میں مجھے آپ کو اور ہم سب کو زندگی گزارنا ہوگی۔

---

### حسن عباسی، لاہور

ایک دیا اور ایک گلاب
مٹھی بھر ہیں میرے خواب
پھول کے اندر تیرتا ہے
نیلے پانی کا تالاب
آئینے توڑ کے بہہ نکلا
سندر چہروں کا سیلاب
ان آنکھوں کی جھیلوں تک
اُڑ کر جائے آپ کتاب
گر کر خود ہی ٹوٹ گئی
بوتل میں تھی تیز شراب
دیر پڑی تو اور بڑھے
رنگ ہزار، ہزار سراب

### لیلیٰ صفدر، لاہور

لمحہ لمحہ بکھر رہے ہیں لوگ
یعنی قسطوں میں مر رہے ہیں لوگ
زیست دوزخ ہے زیست جنت ہے
دونوں جانب اُتر رہے ہیں لوگ
راستے گرد گرد ہیں سارے
اور ان سے گزر رہے ہیں لوگ
کیسے ہجرت پہ ہو گئے مجبور
جس جگہ عمر بھر رہے ہیں لوگ
خوف پھیلا ہے ایسا گلیوں میں
اب گھروں میں بھی ڈر رہے ہیں لوگ
زندگی اس طرح گزارتے ہیں
جیسے تاوان بھر رہے ہیں لوگ
لیلیٰ اس کا حساب تو ہوگا
یہاں جو کچھ بھی کر رہے ہیں لوگ

# شاعری

خوشی کی اب فراوانی بہت ہے
مسلط مجھ پہ حیرانی بہت ہے
تصور بھی ہے اب ان کا گریزاں
فقط یہ ہی پریشانی بہت ہے
بہت نزدیک ہے شہرِ خموشاں
یہاں مرنے کی آسانی بہت ہے
بڑھائیں نرخ کیا بازارِ جاں میں
ستم کیشوں کی ارزانی بہت ہے
کروں کیا پانچ دریاؤں کا پانی
مری آنکھوں میں بھی پانی بہت ہے
میں اشکوں سے وضو کرتا رہا ہوں
تیمم کی یہ آسانی بہت ہے
تلاطم سا مچا ہے شہرِ جاں میں
بغیرِ آب طغیانی بہت ہے
کسی کی اور کیا خواہش کروں اب
وہی اک دشمنِ جانی بہت ہے
وفا کر کے جفائیں سہہ رہا ہوں
مری خصلت میں نادانی بہت ہے
ادب کے واسطے ہے وقف ناصرؔ
اگر سمجھو یہ قربانی بہت ہے

ناصر زیدی/لاہور

گوشۂ چشم سے گوہر ہے نکالا میں نے
ایک آنسو سے کیا گھر میں اُجالا میں نے
تشنگی اس کے تصور سے بجھی جاتی ہے
گھر میں رکھا تھا جو مٹی کا پیالہ میں نے
مجھ کو سقراط کی روایت بہت یاد آئی
رکھ دیا طاق میں جب زہر پیالہ میں نے
اک بلندی کے سفر کا تو ثمر ہے یہ بھی
چاند کا داغ کیا پاؤں کا چھالا میں نے
اُس کے ہر جبر کو سینے سے لگا رکھا ہے
دل سے برداشت کیا دیس نکالا میں نے
ہر طرف دیکھ کے دیکھی ہیں مثالیں اُس کی
پھول دیکھا ہی نہیں دیکھنے والا میں نے
بزمِ یاراں میں مسرت کا ٹھکانا ہی نہیں
جب دیا تیرا مقالے میں حوالہ میں نے
کتنے ہی نقش بنے میرے مکاں میں ثاقبؔ
زیبِ دیوار کیا آنکھ کا جالا میں نے

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

جو تھے دل ونظر کے تقاضے نہیں رہے
اب وہ بھی جیسے تھے کبھی ویسے نہیں رہے
ہر شخص اپنے اپنے مسائل میں گھر گیا
اب تیرے،میرے تذکرے اُتنے نہیں رہے
وہ مرکزِ نگاہ در و بام اب کہاں
وہ محورِ خیال دریچے نہیں رہے
یوں دے رہے ہو پیاس بجھانے کا مشورہ
جیسے کہ اب فرات پہ پہرے نہیں رہے
بک جاتے جاہ وثروت ومنصب کے نام پر
ہم اہلِ عشق اتنے بھی سستے نہیں رہے
مشکل کے وقت کا مجھے ادراک تب ہوا
میرے قریب جب مرے اپنے نہیں رہے
ہم اس لیے بھی ٹھہرے نہیں معتبر کبھی
نصرتؔ ہماری جیب میں پیسے نہیں رہے

نصرت صدیقی/فیصل آباد

راستے کی ٹھوکروں سے سیکھ لو
کچھ سبق تو لغزشوں سے سیکھ لو
روشنی تقسیم کرنے کا ہنر
دوستو ان جگنوؤں سے سیکھ لو
کیسے بنتی ہے یہ رنگوں کی دھنک
رنگ برنگی تتلیوں سے سیکھ لو
پیار کیسے دل میں کر لیتا ہے گھر
میرے دل کی دھڑکنوں سے سیکھ لو
ظلم تیرے کس طرح پسپا ہوئے
میرے دل کے حوصلوں سے سیکھ لو
کوئی موسم مستقل رہتا نہیں
آتے جاتے موسموں سے سیکھ لو
اُجلے منظر کس طرح میلے ہوئے
شہر کی ویرانیوں سے سیکھ لو
سلسلے دار و رسن کے ہیں طویل
سولیوں سے مقتلوں سے سیکھ لو
نیم وا آنکھوں میں کیا تحریر ہے
جھانک کر ان چلمنوں سے سیکھ لو

جاگتے ہیں خواب بننے کا ہنر
تم جلیل ان رتجگوں سے سیکھ لو

جلیل احمد/اوکاڑہ

زندگی تنگ ترے الاپ سے میں
ڈرنے لگتا ہوں اپنی چاپ سے میں
وجد میں تھاپ مجھ سے لپٹی ہے
اور لپٹا ہوا ہوں تھاپ سے میں
تجھ سے ملنے کی آرزو لے کر
آج نکلا ہوں اپنے آپ سے میں
سرد راتوں میں آہ بن کے اُٹھی
جل گیا تھا وہیں پہ بھاپ سے میں
تھی کڑی دھوپ گھر سے باہر تو
پر کبھی کہہ سکا نہ باپ سے میں
سن کے بے چین ہو گی دور ہے وہ
جو یہاں جل رہا ہوں تاپ سے میں
رنج ملتا ہے روز مجھ سے گلے
تھک گیا ہوں ترے ملاپ سے میں

نیازت علی نیاز/لاہور

درختوں پر کسی کا نام لکھ کر چھوڑ دیتا ہوں
نظر کو جو نہیں بھاتے وہ منظر چھوڑ دیتا ہوں
مری نظریں تو ہیں اُڑتے پرندوں کے تعاقب میں
جو میرے ہاتھ آتے ہیں کبوتر چھوڑ دیتا ہوں
ہوائیں جب سناتی ہیں ترے آنے کی خوشخبری
ضروری کام بھی اکثر میں کل پر چھوڑ دیتا ہوں
رفیقوں سے وفا کرنا مری فطرت میں شامل ہے
وفاؤں کا صلہ کیا ہے یہ اُن پر چھوڑ دیتا ہوں

مناظر حُسنِ فطرت کے کبھی جو مضمحل دیکھوں
تو کاغذ کی نئی تتلی بنا کر چھوڑ دیتا ہوں
کبھی آنکھوں سے پیتا ہوں کبھی دستِ حنائی سے
جو مینا ہاتھ لگ جائے تو ساغر چھوڑ دیتا ہوں
کسی کی یاد مجھ کو رات بھر سونے نہیں دیتی
سحر جب نیند آتی ہے تو بستر چھوڑ دیتا ہوں

اکرم سحر فارانی/لاہور

حالانکہ خسارے پہ خسارہ ہو رہا ہے
زندہ ہوں مگر، اور گزارہ ہو رہا ہے
ممکن ہے کہ اس بار نتیجہ کوئی اور ہو
حالانکہ وہی کام دوبارہ ہو رہا ہے
برداشت نہیں ہوتا تھا جو پہلے کسی طور
اب کتنی سہولت سے گوارا ہو رہا ہے
تھوڑا سا بھی کرتے ہوئے لگتا تھا بڑا وقت
اور آج تو اک بار میں سارا ہو رہا ہے
کچھ حوصلہ افزائی کا ہے شائبہ اس میں
موہوم سہی، ایک اشارہ ہو رہا ہے
پھر بھی کیے جاتے ہیں مسلسل اسے جبکہ
نقصان لگاتار ہمارا ہو رہا ہے
آغاز میں گاہک بھی ذرا گھیرنے ہیں نا
یونہی تو نہیں سودا ادھارا ہو رہا ہے

گل فراز/بڈالی

## زخم

رینگتے ہوئے دماغ بھید بن رہے تھے
بھنبھناتی ہوئی آوازیں انہیں بدکا رہی ہیں
پل صراط کے یہ راہی گڈمڈ سے ہو گئے ہیں
ان رینگتوں کے پنچے کورنش بجا رہے ہیں
اپنی عادت بنا رہے ہیں
دیواروں سے چمٹے جا رہے ہیں
چنچنی تڑختی دھوپ سے یہ بلبلا رہے ہیں
راہیں بنا رہے ہیں
چلتے ہی جا رہے ہیں
ان کے متعلقہ زخم جسموں پر ہیں نمایاں
جنبش ان جسموں میں ہونے بھی نہیں پاتی
یہ رینگتے ہی رینگتے ان کو کھاتے جا رہے ہیں
زخم در زخم لگاتے جا رہے ہیں
یہ محکوم کا ہے مسئلہ حاکم کی تابعداری
روپوش خواہشوں کو مدھم کسک ہے لیکن
عیاں ہو کے مبادا چیخوں میں بدل جائے
سسکیوں، آہوں کی دنیا پر کچھ اور وحشت سی طاری ہو
کسک پھر خواہش نہ بن سکے گی
سسکیوں، آہوں پرے وحشت کو دور کر دو
یہ محکوم کا ہے مسئلہ حاکم کی تابعداری
پیوند لگے سینوں پر چڑھ کر بھینچ لیں گے
یہ رینگتے ہوئے جسموں کو پنجوں سے کھینچ لیں گے

احمد عدنان طارق/فیصل آباد

# بقیہ انٹرویو ڈاکٹر تبسم کاشمیری

**حسن عباسی:** عموماً یہ ہوتا ہے کہ ابتدا میں شاعر اپنی شاعری کی کتاب پہلے شائع کراتا ہے بعد میں کسی اور صنف کو اہمیت دیتا ہے۔ مگر آپ کی ایڈیٹنگ کی کتب پہلے شائع ہوئیں۔ پھر تنقید کیں اور بعد میں تخلیق کیں۔ اس کی کیا وجہ؟

**ڈاکٹر تبسم کاشمیری:** جی آپ نے کافی لمبی بات بات کی۔ اپنی پروفیشنل زندگی میں نجی زندگی میں جو میرا ذاتی معاملہ تھا میں سمجھتا تھا۔ سب سے اچھے نتائج اُس میں آئیں گے۔ اس لیے میں نے ایڈیٹنگ کی۔ بہت سی کتابوں کی رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادب اُردو'' ۱۹۲۶ء میں چھپی اُس کی ایڈیٹنگ اس طرح آب حیات کی ایڈیٹنگ کی مضامین لکھتا رہا۔ وہ بھی چھپتے رہے۔ نظموں کے چھ سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جدید اور کلاسیکی غزل سے دلچسپی بیک وقت رہی۔ اقبال پر بھی تین کتابیں ہیں۔ مگر زندگی کا حاصل ایک کتاب ہے۔ اردو ادب کی تاریخ۔

**حسن عباسی:** جی میں نے آپ کی یہ کتاب پڑھی ہے۔ بلاشبہ یہ تنقید میں ایک بڑا تخلیقی کام ہے اور دیگر ادبی تواریخ سے منفرد ہے۔

**ڈاکٹر تبسم کاشمیری:** جی تو میں کہہ رہا تھا مشفق خواجہ نے مجھ سے ایک بار کہا ایک کتاب کافی ہوتی ہے۔ عمر کے اس حصے میں یاد آتا ہے اس کی بات ٹھیک تھی۔ میں اوساکا یونیورسٹی میں تھا وہاں پر کوئی ذہنی دباؤ نہیں تھا اور نہ ہی بہت زیادہ مصروفیت ہوتی تھی۔ مگر اس کے باوجود اردو ادب کی تاریخ اور اس کا قدیم دور وہ بھی جاپان میں بیٹھ کر لکھنا ناممکن تھا۔ ہندوستان میں میرے دوست خلیق انجم تھے۔ پاکستان میں بھی مختلف ادبی اداروں میں دوست تھے۔ ان کو فہرستیں تھما دیتا اور وہ کتابیں بھیج دیتے تھے۔ وہاں یونیورسٹی میں مجھے یہ سہولت تھی کہ کتب کی بہت فہرستیں آتی تھیں اور میں نے ہر موضوع پر بہت زیادہ کتب منگوائیں۔ اس طرح ذہن میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔ میں ۱۰۰ ڈالر تک کی کتاب منگوا لیتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ بعد میں یہ کتب لائبریری کو دے دوں گا۔ ڈرونگ سے مجھے بہت دلچسپی تھی۔ اسی طرح ادب اور تاریخ سے بھی کافی لگاؤ تھا۔

**حسن عباسی:** کیا آپ سمجھتے ہیں ان سب موضوعات کو پڑھنے سے آپ کو اُردو ادب کی تاریخ لکھنے میں کافی فائدہ ہوا؟

**ڈاکٹر تبسم کاشمیری:** جی میں سمجھتا ہوں اس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ میں نے وہاں کرنا کیا تھا۔ صرف پڑھا اور اُس کے بعد یہ کام۔ ہر کام کا وقت ہوتا ہے اور بہت سے عوامل اُس کو مل کر پورا کرتے ہیں۔ یہ اس کتاب کے لکھنے کا وقت تھا۔ یہ چیزیں مکمل Involvment سے بنتی ہیں۔ جیسا کہ پنجابی میں کہتے ہیں ناں کہ کھب جانا، تو ایسا ہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس کو لکھنے کے دوران جیسے میں جاپان میں ٹرین میں سفر کرتا تھا اور شارٹ ہینڈ میں لکھتا چلا جاتا تھا۔ تو کبھی تو آٹھ دس اسٹیشن آگے نکل جاتا۔ پھر واپس آتا اور غلط ٹرین پر سوار ہو جاتا۔

**حسن عباسی:** تو کیا تنقید کا کام یعنی اس کتاب کا دوسرا حصہ لکھنے کا کام اب بھی جاری ہے؟

**ڈاکٹر تبسم کاشمیری:** کئی بار کوششیں کی۔ میں سست ہو گیا۔ یہاں آ کر وہاں بڑا چست تھا۔ جوانی بھی تھی اور کچھ زیادہ کام بھی نہیں ہوتا تھا۔ کرنے کو یہی ایک کام تھا۔ بیوی اور بچے پاکستان تھے۔ پہلے میں اکیلا تھا۔ رات کو ۹ بجے تک کتابوں کو دیکھتا رہتا۔ آئیڈیاز آتے پھر رات کو لکھتا رہتا۔ کئی بار ہوا کہ پردے کا منظر بدل جاتا۔ جب باہر دیکھتا صبح ہو چکی ہوتی۔ Involvment کے بغیر کوئی کام کیا جائے تو اس میں جان نہیں ہوتی۔ تنہائی تخلیق کا سب سے بڑا منبع ہے جس میں آپ جو چاہیں لکھ سکتے ہیں۔ بس اپنے کام سے خلوص و محبت کی ضرورت ہے۔

**حسن عباسی:** تنقید کا بیشتر کام ۷۰ء سے قبل کی ادیبوں پر نقادوں نے کیا نصف صدی سے نئے لکھنے والوں پر اس طرح کام نہیں ہو رہا۔

**ڈاکٹر تبسم کاشمیری:** میرے خیال میں کافی کام ہوا ہے۔ ہمارے ادبی اداروں اور تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ پر بیسیوں تھیسز لکھے جا چکے ہیں۔ مجید امجد پر بھی کافی کام ہوا۔ اس طرح افسانے میں مظہر الاسلام پر۔

**حسن عباسی:** آپ کا مطلب ہے صرف یونیورسٹی کی سطح پر کام ہوتا ہے۔

**ڈاکٹر تبسم کاشمیری:** اس طرح کے کام دانش گاہوں میں ہوتے ہیں۔ وہاں ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کو یا عامر بن علی کو تو ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے کاریں بیچنی ہیں ہم نے بھی تو کچھ بیچنا ہے۔ (زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے)

**عامر بن علی:** جاپان میں ۲۵ سال گزارنے کا تجربہ کیسا رہا۔ تدریسی اور سماجی سطح پر؟

**ڈاکٹر تبسم کاشمیری:** کوئی جاپانی اگر پاکستان آئے تو وہ بہت جلد ہمارے معاشرے کے مزاج کو سمجھ جائے گا۔ کیونکہ ہم نے جو بات کرنی ہے صاف کر دینی ہے۔ مگر جاپانی سوسائٹی کو سمجھنا آسان نہیں۔ ان کے اندر اُترنا پڑتا ہے۔ آپ تو وہاں رہ رہے ہیں۔ جب تک ۱۵ سے ۲۰ سال وہاں نہ رہیں سمجھ نہیں آتی۔ اگر جاپانی کو آپ پر اعتماد ہے تو وہ آپ سے اپنے دل کی بات کرتا ہے۔ میں جب وہاں تھا تو اخباروں میں پڑھتا تھا امریکی چیختے تھے کہ یہ بڑی گول مول بات کرتے ہیں کھل کر نہیں بتاتے۔ مثلاً پراڈکٹ بیچنے کے دو ہی طریقے ہیں یا آپ کہیں گے ہاں یا آپ کہیں گے یہ پراڈکٹ ہمیں نہیں چاہیے۔ یہ جاپانی مزاج نہیں ہے۔ اس میں نہ کا لفظ نہیں ہے۔ جب آپ بہت تنگ کریں گے تو وہ کہیں گے اچھا ہم دیکھیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پراڈکٹ ہم نے نہیں لینی۔ سچ کہوں تو جاپانی کلچر کے باطن کو سمجھنا ناممکن ہے۔ وہ

کمٹمنٹ کرنے کے لیے جلدی تیار نہیں ہوتے۔ ویسے وہ بڑے Humble لوگ ہیں۔ ان میں غرور اور فخر نام کی کوئی چیز نہیں۔ جس طرح ہم پاکستانیوں کو عادت ہے بڑی بڑی باتیں کرنے کی۔ وہاں کی بہت بڑی کمپنی Mitsubishi کے مالک کو میں نے منظر عام پر آتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کے کلچر کا رواج ہے جو اپنی خودستائی کرے اس کو بہت بڑا بے وقوف سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں جاپانیوں کا مزاج بارش جیسا ہے جو ہلکی ہلکی مسلسل ہوتی رہتی ہے۔ انھوں نے اُستاد ہو یا شاگرد۔ تھوڑا تھوڑا کام روزانہ کی بنیاد پر کرنا ہے۔ جبکہ یہاں اس کے بالکل اُلٹ مزاج ہے۔

**لئیق صفدر:** نئی نسل ادب میں کس حد تک سنجیدہ ہے۔

**ڈاکٹر تبسم کاشمیری:** بالکل سنجیدہ ہے غیر سنجیدہ تو نہیں ہو سکتی۔ آخر انہوں نے بھی کچھ سوچ رکھا ہے۔ جب ۱۰ سے ۱۵ سال گزر جاتے ہیں تو نئے تجربے کی گنجائش نکل آتی ہے۔ ہمارے سینئر شاعر ادیب ہم سے نفرت کرتے تھے۔ جب وقت گزرا تو اس نے ثابت کیا ہماری سوچ درست تھی۔ اگر نئی نسل کے لوگ تجربے کی قوت کے ساتھ آئیں تو ان کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ لہٰذا اچھی کہانی بھی لکھی جا رہی ہے اور اچھا ناول بھی۔ اور اچھی شاعری بھی ہو رہی ہے۔ ہم نے بڑے دکھ سہے ہیں مجھے اس کا بڑا تجربہ ہے۔ بہت سے ہمارے سینئر شاعر ہم کو بڑی حقارت سے دیکھتے تھے۔ میں اسلامیہ کالج سول لائنز میں بی اے کا طالب علم تھا۔ پروفیسر عزیز الدین احمد اب بھی زندہ ہیں۔ وہ حلقے کے سیکرٹری تھے۔ انھوں نے مجھے حلقے میں غزل پڑھنے کا کہا۔ دستور کے مطابق میں ۱۵ سے ۲۰ کاپیاں نظم کی لے گیا۔ پتہ نہیں صدر کون تھا۔ باقی لوگوں کی طرح انجم رومانی صاحب نے بھی نظم پڑھی۔ ان سے صاحب صدر نے پوچھا تو انھوں نے کاغذ اُلٹا کر رکھ دیا اور کہا کہ اس سے تو سادہ کاغذ بہتر ہے۔ کم از کم اس پر کچھ لکھا تو جا سکتا ہے۔ نئے لوگوں کے ساتھ ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی سرپرستی کرنی چاہیے۔

**لئیق صفدر:** شاعری کا مستقبل آپ غزل میں دیکھتے ہیں یا نظم میں؟

**ڈاکٹر تبسم کاشمیری:** دونوں میں۔ نئی شاعری کی تحریک چلی ہے۔ آپ ۷۰ء کی غزلیں دیکھیں اور ۶۰ء کی غزلیں دیکھیں۔ آپ کو فرق صاف اور واضح نظر آئے گا۔ میرے خیال میں ہمارے ہاں نظم نے بہت ترقی کی ہے۔ اسی طرح غزل بھی بہت اچھی لکھی جا رہی ہے۔ ہاں البتہ نثری نظم لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ اس میں یا نظم ہوگی یا نہیں ہوگی۔ پل صراط سے گزرنے والی بات ہے۔ یا آپ جنت میں گریں گے یا جہنم میں۔

**لئیق صفدر:** آپ جاپانیوں کو اُردو زبان سکھاتے رہے ہیں۔ یہ تجربہ کیسا رہا؟

**ڈاکٹر تبسم کاشمیری:** میں زبان تو نہیں سکھاتا تھا۔ جب وہ زبان سیکھ جاتے تھے تب ان کو اُردو پڑھاتا تھا۔ مجھے زیادہ تجربہ ہوتا تھا جب میں غزل پڑھاتا تھا۔ اُردو غزل میں محبوبہ کی زُلفیں، گیسوئے دراز، ان کے نزدیک تو صرف بال ہیں۔ Feelings کہاں سے لائیں؟ میر کا شعر ہے:

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

جاپانیوں کی آنکھیں چھوٹی ہیں تو مستی کہاں سے آئے۔ حالانکہ وہ شراب پینے والی قوم ہے۔ اسی طرح پاکستانی ہائیکو گو شاعروں کا ایک بھی ہائیکو نہیں دیکھا جو ہائیکو ہو۔ پاکستانی شاعری میں تو سارا جذبات اور احساسات کا کھیل ہے۔ جبکہ ہائیکو تو موسموں کی شاعری ہے۔ جیسے ہمارے ہاں ۱۲ ماسہ ہوتا ہے۔ جیسے ساون اور دوسرے مہینوں کے گیت۔ ہائیکو بھی موسموں کے ذکر کی شاعری ہے۔ آپ ہائیکو میں جذبات، احساسات نہیں لا سکتے۔ مثلاً ایک جاپانی ہائیکو ہے۔

بادشاہ ایک گاؤں میں گیا، مہمان رہا
دوسرے دن خدام نے دیکھا
اس کا تکیہ گیلا تھا

یہ لائٹ سمبولک مزاج ہے جاپانی شاعری کا۔ Untold قسم کا رویہ۔ اس کا مطلب ہے لوگوں نے بادشاہ کو آ کر بتایا کہ وہ پریشان ہیں اور دکھ میں ہیں تو وہ رات بھر روتا رہا۔ اگر یہ مضمون ہمارے ہاں ہوتا تو شاعری میں طوفان برپا ہو جاتا۔ ایک اور جاپانی ہائیکو ہے:

بارش ہے اور ایک مینڈک تالاب میں کود گیا ہے
آپ دیکھیں اس میں جذبہ بالکل نہیں ہے۔

**لئیق صفدر:** اُردو ادب میں آج تک جو تنقید کا کام ہوا ہے اسے آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

**ڈاکٹر تبسم کاشمیری:** ہمارے ہاں تنقید کی روایت ہی نہیں ہے۔ اردو شاعری کی ابتدا سے حالی کا مقدمہ شعر و شاعری اور اس کے بعد 50 برس کی خاموشی۔ مختلف تحریکیں سامنے آئیں۔ پاکستان بننے کے بعد تنقید لکھی گئی۔ ہماری تنقیدی روایت Creative نہیں ہے اور نہ ہی ہم Producer ہیں۔ ہم نے جب ناول پڑھا تو ناول لکھنا شروع کر دیا۔ بیسویں صدی میں دنیا میں افسانہ مشہور ہوا تو ہم نے افسانہ لکھنا شروع کر دیا۔ ہمارے ہاں ٹیکنالوجی نہیں ہے تو ٹیکنیک کہاں سے آئے گی۔ ہمارے ہاں چیزیں جاپان یا دیگر ممالک سے آتی ہیں تو ہم لے لیتے ہیں۔ خود Produce نہیں کرتے۔ تنقید کی کوئی بڑی کتاب سوائے حالی کے۔ وہ بھی مغرب سے متاثر تھے، ماضی میں نہیں آئی۔ انہوں نے بھی شاعری کے معیار پر کتاب لکھی۔ اب تک جتنی تھیوریاں جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات ہیں وہ مغرب سے ہیں۔ ہمارے نقاد ان کو پڑھتے ہیں اور تھیوریاں بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ مغرب کے باطن سے نکلی ہیں۔ ان کے تجربے کا حصہ ہیں۔ ہمارے ہاں وہ تجربہ ہی نہیں تو ہم ان کو اپنے ادب پر اپلائی کیسے کر سکتے ہیں۔ نہ ہماری سوسائٹی میں Capitalism کا تجربہ ہے نہ Socialism کا اور نہ Marxism کا۔ ہم چیزوں سے متاثر تو ہو سکتے ہیں انھیں بنا نہیں سکتے۔ سائیکل سے زیادہ ہم نے کیا بنایا ہے۔ موٹر سائیکل آج تک نہیں بنا سکے۔ ہم ایٹمی پاور ہیں موٹر سائیکل کا چین چین سے منگواتے ہیں تو تنقید کیسے بنا سکتے ہیں۔

# مختصر ادبی خبریں

✦ حرف اکادمی کے زیر اہتمام 24 اکتوبر کو راولپنڈی آرٹس کونسل میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس کی صدارت رحمان حفیظ نے کی۔ میزبان چیئر مین کرنل مقبول حسین تھے۔ ملک بھر سے شعراء نے شرکت کی۔

✦ 27 اکتوبر کو معروف شاعر دلاور علی آذر کے ساتھ ادبی تنظیم ''بہارِ نو'' کے زیر اہتمام حضرو میں ایک شام کا اہتمام کیا گیا۔

✦ معروف شاعر غلام حسین ساجد ان دنوں علیل ہیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جلد صحت کاملہ عطا فرمائے۔

✦ ڈاکٹر اجمل نیازی اپنے چاہنے والوں کی دُعاؤں کے باعث ہسپتال سے گھر منتقل ہو گئے ہیں اور ان کی طبیعت بتدریج بہتر ہو رہی ہے۔

✦ شاعر اور ناول نگار ڈاکٹر وحید احمد کی والدہ گزشتہ دنوں انتقال فرما گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

✦ اکادمی ادبیات اسلام آباد میں گزشتہ دنوں ایک سیمینار بعنوان فکر اقبال میں سائنسی شعور منعقد کیا گیا۔

✦ ادبی تنظیم بزمِ احبابِ قلم راولپنڈی کے زیر اہتمام ممتاز شاعر ناصر علی سید کے اعزاز میں ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت نامور شاعر حلیم قریشی نے کی۔ تقریب میں مختلف شہروں سے شعراء نے شرکت کی۔

✦ ادارہ اُردو اسلام آباد کے زیر اہتمام سیمینار بعنوان ''جدید اُردو نظم اور ہیئت کے مباحث'' منعقد ہوا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر نوازش علی نے کی۔ مقالات ڈاکٹر ضیاء الحسن اور ڈاکٹر یٰسین آفاقی نے پیش کیے۔

✦ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا سوفٹ ویئر تیار کر لیا گیا جو خود کار طریقے سے املا کی غلطیاں درست کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس سافٹ ویئر کا باقاعدہ افتتاح نیشنل بک فاؤنڈیشن کے تین روزہ دسویں سالانہ میلے میں ہوا۔

✦ علی گڑھ اوٹاوہ عالمی ایسوسی ایشن کینیڈا کا چھٹا سالانہ مشاعرہ 2019 منعقد ہوا جس میں طارق فاروق، عظمیٰ محمود، عرفان ستار، رشید ندیم، عاصم جاسر، راشد شاہ، عابد حسین عابد، افضال نوید، ولی عالم شاہین اور تبسم انوار نے شرکت کی۔

✦ اعجاز نعمانی کے شعری مجموعہ ''کہے بغیر'' کی تقریب پذیرائی 31 اکتوبر 2019ء کو پرل کانٹی نینٹل ہوٹل مظفر آباد میں منعقد ہوئی اور صدارت جناب جمیل الدین عالی نے کی۔

✦ معروف پنجابی شاعر بابا سہوتہ کی رہائش گاہ پر پنجابی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں باباجی کی طرف سے شعراء میں ایوارڈ و شیلڈز پیش کی گئیں۔ اس مشاعرہ میں پنجابی کے نامور شعرا بابا نجمی، تجمل کلیم، صابر ناز، ارشاد احمد سندھو، ابرار ندیم اور دیگر نے شرکت کی۔

✦ جناب مظہر سلیم مجوکہ کی زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ بک ڈائجسٹ کا محمد حمید شاہد نمبر شائع ہو گیا ہے۔

✦ معروف بزرگ شاعر اعجاز رحمانی انتقال فرما گئے ہیں۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون

✦ زاویہ اور وانی کے زیر اہتمام سعید اختر ملک کی کتاب ''سوچ دروازے'' کی اسلام آباد کلب میں تقریب ہوئی۔

✦ فیل (Feel) کے زیر اہتمام کشمیریوں کے ساتھ اظہار یک جہتی کے لیے محفل مشاعرہ 19 نومبر بروز منگل اکادمی ادبیات پاکستان کے دفتر میں منعقد ہو گا جس میں شعراء کی کثیر تعداد شرکت کرے گی۔

✦ سفیرانِ ادب برطانیہ اور قلم قبیلہ سکاٹ لینڈ کے زیر اہتمام محفل مشاعرہ 29 اکتوبر 2019ء کو گلاسکو میں منعقد ہو گی جس میں برطانیہ اور پاکستان کے شعراء شرکت کریں گے۔

✦ سالانہ میوزک کانفرنس ناصر باغ لاہور میں اکتوبر کے آخری ہفتہ میں منعقد کی جس میں ں ملک بھر سے نامور گلوکاروں نے شرکت کی۔

✦ مسقط میں مقیم نوجوان شاعر قمر ریاض پاکستان آئے تو ان کے اعزاز میں مختلف ادبی تنظیموں کی طرف سے تقاریب کا اہتمام کیا گیا۔

✦ عالمی ادب اکادمی کلر کہار کے زیر اہتمام مشاعرہ 27 اکتوبر کو گرینڈ امپریل ہوٹل کلر کہار میں منعقد ہوا جس میں ملک بھر سے شعراء نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

✦ حلقہ علم و ادب اور بزمِ کوثر کا چھٹا ماہانہ نعتیہ مشاعرہ یکم نومبر کو غضنفر اکیڈمی دارلسل بلڈنگ ملتان میں منعقد ہوا۔

✦ الحمرا میں 27 اکتوبر کو بلیک ڈے نمائش کا افتتاح ایگزیکٹو ڈائریکٹر الحمرا اطہر علی خاں نے کیا۔ انہوں نے کشمیریوں پر بھارتی مظالم اُجاگر کرتے فن پارے دیکھے اور آرٹسٹوں کے کام کو سراہا۔

✦ بزمِ ریاض رومانی کا ماہانہ مشاعرہ مغل پورہ سوسائٹی سکول و کالج کی لائبریری میں ں منعقد ہوا جس کی صدارت عباس مرزا نے کی۔ جبکہ مہمان خصوصی مدیر ارژنگ حسن عباسی تھے۔ اس مشاعرے میں بہت سے نامور شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

✦ ماہنامہ ارژنگ کے مدیر اعلیٰ عامر بن علی گزشتہ ماہ جاپان سے پاکستان آئے تھے۔ یہاں قیام کے دوران ان کے ساتھ مختلف ادبی تنظیموں نے تقاریب کا اہتمام کیا۔ انہوں نے شاعروں ادیبوں سے ملاقاتیں بھی کیں۔

# تبصرۂ کتب

نام کتاب : صدیق سالک.شخصیت اورفن/مصنفہ : ڈاکٹر صائمہ علی / سنِ اشاعت : 2019ء / قیمت : 800روپے

ناشر : بک سٹریٹ،46-مزنگ روڈلاہور۔فون042-37231518

---

زیرِنظر کتاب ''صدیق سالک:شخصیت اورفن'' ڈاکٹر صائمہ علی کی تصنیف ہے۔اس کتاب میں مصنفہ نے بریگیڈیئر صدیق سالک کی زندگی کے نشیب وفراز کا جائزہ لیا ہے،جس میں ان کی فوجی خدمات،ادبی خدمات اوربطور استادان کی تعلیمی خدمات کا تفصیلی ذکر ہے۔

ڈاکٹر صائمہ علی اپنی کتاب کے پیش لفظ میں لکھتی ہیں:''صدیق سالک نے ایک غیر معمولی زندگی گزاری۔شعور سے پہلے احساسِ یتیمی،غربت اورپس ماندگی کے باوجود بریگیڈیئر کے عہدے تک پہنچے،نازک ترین دور میں ڈھاکہ میں تعیناتی،ملک کو دولخت ہوتے دیکھنا،جنگی قیدی بننا،بھارتی قیدوبند کی صعوبتیں اُٹھانا،ضیاءالحق کا پریس سیکریٹری اور تقریر نویس ہونا،عالمی شہرت کے حامل سانحہ بہاولپور میں وفات پانا۔زندگی کے ان نشیب وفراز کا عکس ان کی تحریروں میں ملتا ہے۔ان کی زیادہ تر تحریریں ان غیر معمولی واقعات کے متعلق ہی ہیں۔اس کتاب میں اُن کی ذہنی کشمکش کو سمجھنے اورنفسیاتی گرہیں کھولنے کی کوشش کی گئی ہے۔صدیق سالک ایک وسیع الجہات ادیب ہیں اُن کی بنیادی شہرت بطور مزاح نگار ہے لیکن اُن کی مقبولیت بطور مؤرخ اور ناول نگاری کے حوالے سے ہے۔کتاب میں اس کے علاوہ بطور آپ بیتی نگار،سفرنامہ نگار، انگریزی مصنف اور تقریر نویس اُن کی ادبی حیثیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ان کی تصنیف ''ہمہ یاراں دوزخ'' کو دلائل کے ساتھ ''رپورتاژ'' قرار دیا گیا ہے۔''

پروفیسر فتح محمد ملک کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:''صدیق سالک شہید کی ذات اور صفات کی پہچان اور تحسین اُردو تنقید پر ہنوز ایک قرض ہے۔صائمہ علی کی زیرِ نظر تصنیف اس قرض کو چکانے کی ایک قابلِ قدر کاوش ہے۔انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں صدیق سالک کی شخصیت اور فن کو عصری تعصبات سے آزاد ہو کر سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے صدیق سالک کے ذہن وذوق اور کارنامۂ فن کا مطالعہ مروجہ تعصبات سے آزاد ہو کر پیش کیا ہے۔صدیق سالک پڑھنے لکھنے کی لگن رکھنے والے ایک سچے اور کھرے ادیب تھے۔وہ ادب وفن اور علم ودانش کو اپنی زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع سمجھتے تھے۔روٹی روزگار کی دوڑ کا آغاز بھی انہوں نے اوّل اوّل ایک معلم اور مدرس کی حیثیت میں کیا تھا۔بعدازاں وہ ہمارے عسکری وجود کے محافظوں میں شامل ہو گئے تھے۔ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کی یہ پیشہ وارانہ وابستگی ان کے علمی و ادبی کارناموں کی تحسین کی راہ کا سنگِ گراں ہو کر رہ گئی ہے۔مجھے یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب کی اشاعت صدیق سالک کے ادبی مقام ومرتبے کے تعین میں حائل تعصبات کو دُور کرنے کا فریضہ سرانجام دے گی۔صائمہ علی نے ایک روشن اور مستحکم استدلال کے ساتھ سالک شہید کے ادبی کارنامے کو نمایاں کرنے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔میں اس کتاب کی اشاعت پر انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔''

اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام بک ہوم کے چیئرمین رانا عبدالرحمٰن نے کیا ہے۔ایم سرور نے معیاری پروڈکشن،دیدہ زیب سرورق اور اعلیٰ کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔کتاب مارکیٹ میں موجود ہے۔براہ راست منگوانے کے لیے بک ہوم بک سٹریٹ46-مزنگ روڈلاہور(فون:042-37231518) سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

نام کتاب : ملاپ/شاعر : وحید قندیل / سنِ اشاعت : 2019ء / قیمت : 800روپے / تبصرہ نگار: لبنیٰ صفدر

ناشر : نستعلیق مطبوعات،غزنی سٹریٹ اُردو بازار،لاہور

---

عشق حقیقی ہو یا عشق مجازی تمام راز ونیاز اسی ابدی اور بے مثال جذبے کی وجہ سے کائنات میں وقوع پذیری کا باعث بنتے ہیں۔دنیا کے ہر جذبے کا انت محبت کے پڑاؤ پر ہی ہوتا ہے۔سب سکون،تمام سکھ اسی اُلوہی جذبے کے محتاج ہیں اور جسے سچی محبتیں نصیب ہو گئیں گویا اُس نے دونوں جہان پا لیے۔شاعر کے ہر شعر میں روحانیت اور محبت کا رچاؤ اس کی گداز دلی کا ثبوت ہیں۔ایسی ہی محبتوں سے گندھی ہوئی شاعری آسٹریلیا میں مقیم شاعر وحید قندیل کی بھی ہے،جو فکرِ روزگار کے ساتھ ساتھ فکرِ سخن سے

اپنا رشتہ بہت مضبوطی سے قائم رکھے ہوئے ہیں۔تو، میں اور محبت کے دائرے میں گھومتی شاعری نے کتابی شکل میں اپنی تجسیم کی ہے جس کا نام انہوں نے "ملاپ" رکھا ہے اور ملاپ یقیناً محبت ہی کا مرہونِ منت ہے۔وہ ان شعرا میں سے ہیں جو مشاعروں کی شہرت سے بے نیاز اپنی تخلیق کے فن کو سنوارنے میں مگن نظر آتے ہیں۔مشاعروں کی سیاست سے الگ رہ کر کسی کی تقلید یا پیروی کیے بناوہ ادبی سرگرمیوں کی اپنی دنیا بسائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کا شعری بیان اسی وجہ سے منفرد اور اپنا رنگ ڈھنگ لیے ہوئے نظر آتا ہے۔اصل میں شاعری اور شاعری کا تخیل شاعر کے ساتھ بیتے واقعات اور سوچ کا پھیلاؤ ہی تو ہے۔وہ اپنی دلی واردات کی ہر کیفیت کی دستک سنتے ہیں اور انہیں نئے الفاظ کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔یہ خاص عنایت انہی پر وارد ہوتی ہے جن پر خدا کی خاص رحمت ہو۔ورنہ دل کی واردات کو بیان کرنا ہر انسان کے بس کی بات بھی تو نہیں ہے۔بعض اشعار میں وحید قندیل نہایت معصومیت سے بڑی بات کو سہل اور سہولت سے ادا کر جاتے ہیں اور یہی ان کے کلام کی خوبصورتی بھی ہے۔زندگی کی طرح شاعری بھی شاعر کی کمٹمنٹ کو ظاہر کرتی ہے۔خوشی، غمی، انتظار، دکھ، بے قراری اور پھر حاصل تک کا تمام سفر مختلف اشعار میں وارد ہوا ہے اور ایسا وہ شخص ہی محسوس کر کے الفاظ کا روپ دے سکتا ہے جس نے ہر راہ گزر کی تکلیف برداشت کی ہو اور پھر اپنی منزل پر اپنی لگن سے پہنچ بھی گیا ہو۔پلک پلک کانٹوں کو چننے کی اذیت کا دکھ باقی رہ جاتا ہے۔شاعری ان تمام دکھوں کا مداوا بھی ہے اور کتھارسس بھی لیکن اُن کے تمام راستے محبت کی منزل پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔یہی ان کی تکمیل بھی ہے اور اسی پر ان کا پڑاؤ بھی۔جہاں وہ آنکھیں موند کر سکھ کے سانس لے رہے ہیں۔اس سے بڑا سکھ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

نام کتاب : ذکرِ رسالت مآب ﷺ/ شاعر : عدیل احمد آسی/ سنِ اشاعت : 2019ء / قیمت : 500روپے

ناشر : نستعلیق مطبوعات، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

---

مومن کی زندگی کے شب و روز کا اصل محور و ہدف حبیب کبریا کا وہ حسین ترین اسوہ ہے جس کے حسین ہونے پر خود رب کائنات نے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۂ حسنہ کی مہر ثبت کی ہے، جس کے اعلیٰ ہونے پر خود رب کائنات نے انك لعلی خلق عظیم کی سند دی ہے اور جن کی گفتگو کے مصدقہ ہونے پر خود رب کائنات نے ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ کا مژدہ سنایا ہے۔جہاں اُسوۂ حسنہ کے مطابق اپنی زندگی استوار کرنا مومن کے لیے خوش بختی و خوش قسمتی ہے وہیں ایک مومن کے لیے یہ بھی اعجاز ہے کہ وہ حکم الٰہی ورفعنا لك ذکرك کی پیروی کرتے ہوئے محبوب خدا کی شانِ اقدس میں لب کشائی بھی کرتا ہے اور کیوں نہ کرے کہ اس کے بغیر نطق و بیان کا حق ادا ہی نہیں ہوتا۔چنانچہ قرون اولیٰ یعنی صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک عشاق کے قافلے درود و سلام اور مدحت و نعت گوئی میں مشغول ہیں اور تا قیامت رہیں گے۔

مبارک باد کے مستحق ہیں، ہمارے دوست اور برادر عدیل احمد آسی جنہوں نے اپنی تصنیف و تالیف کے لیے وہ دائرہ منتخب کیا، جس کا تعلق براہ راست اللہ کے حبیب حضرت کی تعریف و توصیف سے ہے اور جس میں قلم و لسان اور زبان و بیان کا لگ جانا مومن کی معراج ہے۔مصنف نے جس طرز پر اپنی کتاب "ذکرِ رسالت مآب ﷺ" کو ترتیب دیا ہے وہ اپنی جگہ ایک مستقل تبصرہ کا متقاضی ہے بعض جزئیات پر تو ایک قاری کو ایک ایسا تاثر دیا ہے کہ ایک اُمتی کو اپنے نبی ﷺ کی تعریف و توصیف میں کس حد تک گہری معلومات رکھنی چاہئیں۔اس نعتیہ مجموعے میں خوشی کی بات یہ ہے کہ ابتدائی باب حمد اور دُعائیہ اشعار پر مشتمل ہے اور دراصل یہ حقیقت ہے کہ یہ رب کریم کا اس اُمت پر عظیم ترین احسان یہ ہے کہ اس نے ہمیں اپنے محبوب ﷺ کا اُمتی بنایا ہے۔عدیل احمد آسی کا نعتیہ کلام جہاں شعری و فنی لحاظ سے بھی مضبوط کہا جا سکتا ہے وہیں فکری لحاظ سے بھی ان کی نعتوں میں بڑا توازن اور گہرائی موجود ہے۔جناب رسالت مآب ﷺ کی تعریف میں ذرا سی لغزش نعت گو کو حدود کفر میں داخل کر سکتی ہے اور ذرا سی کوتاہی مدح کو قدح میں بدل سکتی ہے۔عدیل آسی کی نعت کی یہ خوبی ہے کہ انہوں نے نعت رسالت مآب ﷺ کو ہر طرح کی لغزش سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں کامیاب رہے ہیں، لیکن اس سے آگے بڑھتے ہوئے انہوں نے مدح خیر الانام ﷺ میں کئی نئے باب بھی قائم کیے ہیں اور ایسی خوب صورت تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا ہے کہ انسان پڑھتا اور سر دُھنتا چلا جاتا ہے۔میں رب رحمٰن و رحیم سے جہاں یہ دعا کرتا ہوں کہ ہمارے بھائی عدیل احمد آسی کے ایمان اور ان کی قوت قلم میں اضافہ عطا فرمائے۔اللھم زد فزد۔وہیں میں دعا گو ہوں کہ اس خدمت و مدحت سرکار دو عالم ﷺ کے طفیل نہ صرف برادر عدیل آسی بلکہ ان کی نسبت سے ہم سب کو محشر میں ساقی کوثر کے ہاتھوں جامِ کوثر اور شفاعت نبوی ﷺ سے ہمکنار فرمائیں۔آمین

She has done considerable work on Iqbal in prose format. Dr. Ajmal Niazi is a popular literary figure. He was born on September 16, 1947 in Musakhel, Mianwali. His grandfather Jehan Khan was Zaildar and was a Sardar (leader). Ajmal was among three brothers who were admitted in Government College, Lahore. Their father was Inspector in Police. He was a learned person and had memorized many good pieces of poetry. Ajmal got his initial training from his father (Page 132). Ajmal admits that he tried saying poetry in his early days His poetry collection 'Pichle Peher Ki Sargoshi' (whispers of afternoon) was published but he became a popular column writer later on.He is however disappointed on the quality of'Mushairas'and fears that such sittingshave hardly played a proper role in nation building lately.

Muhammad Asim Butt spent all his childhood in the walled city of Lahore. His parents hailed from Amritsar. He is affiliated with Academy of Letters since past decade. Interested in sports he won Orange Belt in Karate. Poetry saying was a natural phenomenon for him. In the daily News he was in the translations section. He wrote features also He took interviews. So, his first book 'Doosra Aadami' (the other person) was his book comprising interviews. In the Academy he became editor of its magazine 'Adabiaat'. His two books on stories 'Ishtihaar Aadmi' and 'Dastak' have been printed and a third one is on way. The other interviews by Hassan Abbasi are of Saleem Shahzad, Dr. Suleman Abdullah, Zafar Islam, Ashiq Raheel, Dr. Kausar Mahmud, Lubna Safda, Muhammad Saeed Ullah Siddique, Dr. Nasir Abbas Nayyar and Nazir Qaiser.

Bushra Ijaz is a house wife bur has carried out her desire for saying prose and poetry with passion. She hailed from Sargodha but has been living in Lahore since long. She got married while very young. Her son was in Cambridge when she did her Matriculation. Then she did FA and BA privately. She was fond of reading books even when she lived in her village. Her first attempt at writing a bookwas her impressions of doing Hajj. She desired to say poetry in Urdu bur became popular in Punjabi poetry instead. Her books 'Pabbah Bhaar' and 'Bhulejha' were hailed. She wrote a short story and sent it to Dr. Wazir Agha for 'Auraq'. Then she read a story in Halqa of Sara Hashmi. Her stories' book was also published. Writing was her necessity as she abhorred social attitudes. The other personalities interviewed by Lubna Safdar are Dr. Amjad Parvez. Bushra Rehman. Saeed Aasi, Seema Ghazal, Suhaib Marghoob, Zahoor ul Islam Javed, Naseer Ahmad Nasir, Neelum Ahmad Basheer, Dr. Najma Shaheen Khosa, and Yasmin Hameed. Such interviews open up the interviewee who can express more about the things in their hearts; about the person and trait. The book under review is a good attempt in achieving this goal.

Title: Rubaru (Interviews)/Author (s):Amir bin Ali, Hassan Abbasi, Lubna Safdar / Publishers: Nastaleeq Matbuaat, Lahore / Pages: 448, Price: Rs. 600/-/ Rubaru - a compilation of interviews of famous literary personalities / Daily Times, July 31, 2019

---

The book 'Rubaru' (face to face) comprises compilation of interviews of famous literary personalities by Amir Bin Ali (the latest poetry book Yaad Na Aaye Koi), Hassan Abbasi (the latest poetry book Seheb - Hamdia collection) and Lubna Safdar (the latest poetry book Tum Muhabbat Ka Ista'ara Ho). It is dedicated to Ashfaq Ahmad, Ahmad Nadeem Qasmi, Mushtaq Ahmad Yousufi, Munir Niazi, Munnu Bhai, Mashkoor Hussain Yaad, Shahzad Ahmad, Shuhrat Bukhari and Aslam Kolsri whose interviews are included in this book but they are no more now. A couplet 'Aik Ik Kar Kei Sitaron Ki Tarah Doob Gaye/Haye Kaya Log Mere Halqa-e-Ehbaab Main Thei' (One by one many stars fell who were among the fraternity of my friends) has been quoted which is very apt for this situation. This book contains practically most of the famous names but this reviewer did find some lesser but deserving ones also.

Ahmad Adnan Tariq was born in 1963. His mother was Masters and taught in Tandaliawala. His father was Excise and Taxation Officer. Her mother used to buy novels from Ferozesons and books for children also. So Tariq had an access to these books and he became fond of reading from his childhood. On his mother's demise his juvenileage ended and he moved to Faisalabad from where he completed his studies. After his Masters he joined police service and completed his LLB during his job. He wrote fourteen books for children and on poetry (Page 200). Another intellectual is Dr. Hassan Mubarak from Faisalabad. Psychologically he felt that changing the name of his city of Lyallpur to Faisalabad deprived him of the cultural and historical heritage of the city (Page 201). His poetry collection 'Naye Dinon Kei Khwaab' (dreams of a new day) was instrumental in giving him exposure to public. In 2011 his second selection appeared titled 'Tanha Rehna Seekh Liya Hei'. Apart from poetry, his travelogues were appreciated as well.

Dr. Ali Muhammad Khan is an educationist, critic and one of the great sketch writers. He is writer of 36 books. Tahir Naseem is a poet and a journalist simultaneously. He believes that literature apart from developing oneself should be instrumental in developing the nation (Page 89). Dr. Shahnaz Muzammil is known as 'Maadar-e-Dabistan' (mother of literary city). She is running an organization namely 'Adab Sarae' (Literature Inn) since many years. She was also born in Faisalabad. She is Masters in Library Science followed by DHMS from Holland. Her twenty poetry books have been published.

# نامہ ہائے احباب

عالی مرتب عامر بن علی

آپ کے ''ارژنگ'' کا نام سوہنا اور انہونا ہے۔ ایک غیر مطبوعہ افسانہ حاضر ہے۔ ''پھر'' چھپ جائے تو ''ارژنگ'' بھیج دینا۔

ابدال بیلا/اسلام آباد

بوئی ہزارہ/۲۳ ستمبر ۲۰۱۹ء

پیارے حسن عباسی صاحب!

اسلام علیکم۔ تازہ ارژنگ قدر صاحب اور صاحب صاحب ملا۔ آپ نے شعر وادب میں حسن وخوبی کے ٹھاٹھ لگا دیے ہیں۔ ہر طرف لفظ ومعنی کی مورتیں نقش صورتیں بھی سجائی نظر آتی ہین۔ آپ کی قدر افزائی سے بھی اپنے جوش وجذبہ کو بھی دن لگ رہے ہیں۔ عمران مفتی سے متعلق آپ کا مضمون دل کو لگا اس کی درد بھری کیفیت دل میں تیر کی طرح تیر گئی۔ مرحوم کا کلام خاصا پر اثر ہے۔ انھوں نے بیماری کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ اردو زبان میں محاورات کا استعمال کے باب میں اور مقامات پر بھی ''گفتگو'' ہوئی ہے۔ وہی کوٹھوں چڑھی والی بات ہے۔ محاورہ محاورہ ہے۔ نیت اچھی ہو تو گفتگو اچھی ہوتی ہے۔ آپ نے میرا خط بھی شائع کیا اور غزل بھی شائع کی۔ ارژنگ کی اشاعتی خصوصیات لگی بندھی ہیں۔ یہ لگے بندھے اصولوں پر چل رہا ہے۔ اسد اللہ غالب اور سید مقبول حسین سے مکالمہ اور گفتگو خوب ہے۔ سوالات میں یکسانی کا شائبہ سا ہے۔ بدل بدل کے بات ہو تو لطف پیدا ہو۔ رسالے کی انفرادیت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ارژنگ کی شاعری جدید احساسات پر دارومدار کرتی ہے۔ اس قرینے میں حسن عباسی دور کی کوڑی لاتے ہیں۔

خیر اندیش/آصف ثاقب

محترم عباسی صاحب!

اسلام علیکم۔ رسالہ ''ارژنگ'' ملا۔ اس عزت افزائی کا ~~بہت بہت~~ شکریہ۔ غزل برائے اشاعت قبول فرمایئے۔ اُمید ہے آپ معہ اہل خانہ خیریت سے ہوں گے۔

احقر/نصرت صدیقی

محترم حسن عباسی صاحب!

سلام نیاز۔ ماہنامہ ارژنگ کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ ہر ماہ اس کی ترسیل کے لیے شکر گزار ہوں۔ ستمبر 2019ء کے شمارے میں شعر وادب کا ایک عمدہ ذخیرہ پڑھنے کو ملا۔ حمد ونعت اور سلام خصوصیت کے ساتھ پسند آئے۔ ایک تازہ سلام برائے اشاعت ارسال کر رہا ہوں۔ ادبی خدمات کے حوالے سے ماہنامہ ارژنگ کو کسی بھی سطح پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

وفا کیش

مظفر حسن منصور/خوشاب

محترم عامر بن علی!

سلام مسنون! اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

خوبصورت تحریروں سجا ارژنگ گاہے بگاہے نظر نواز ہو رہا ہے۔ عنایت کا شکریہ!

آپ کی محفل میں شامل ہونے کے لیے ایک کہانی ارسال خدمت ہے۔ اُمید ہے پسند آئے گی۔

دُعاؤں کی طالب

سیما پیروز، لاہور

محترم حسن عباسی صاحب!

اسلام علیکم۔ دُعاؤں کے بعد عرض خدمت ہے۔ چند غزلیں بھجوا رہا ہوں اُمید ہے آپ کے پرچے میں جگہ مل جائے گی۔

میں مشکور ہوں کہ ناچیز کا انٹرویو آپ نے شائع کیا۔ میرے لیے اعزاز کی بات ہے اور میں محترم لُبنیٰ صفدر صاحبہ کا بھی انتہائی ممنون ہوں۔ آپ سے ذاتی تعلقات آپ ایک نہیں دو سے زیادہ دہائیوں پر مشتمل ہیں اور ہمیشہ آپ کو دوست اور بیٹا ہی سمجھا ہے۔ لاہور میں جب ریاض عادل اور میں آئے تھے تو وہ یادیں اب تک ذہن میں محفوظ ہیں۔ عامر بن علی صاحب کا بھی شکریہ کہ انہوں نے پرچہ بھیجا۔

آپ راولپنڈی آئیں تو ضرور ملاقات کریں۔

چند لمحات ساتھ گزریں تو روح و دل کو اچھا لگے گا۔

فقط دُعاگو

کرنل (ر) سیّد مقبول حسین

حسن عباسی جی!

اسلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

''ارژنگ'' پوری آب وتاب کے ساتھ موصول ہو رہا ہے۔ آپ اور آپ کی پوری ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے جن کی محنت سے بذریعہ ارژنگ ادب کو فروغ مل رہا ہے اور پورے ملک کا ادب اور ادبی خبرنامہ پڑھنے کو مل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔ 20 ستمبر کی دوپہر نستعلیق کا آفس نہ ملنے پر حکیم سلیم اختر صاحب کا مطب نظر آگیا۔ وہاں پر موجود اقبال راہی صاحب، فراست بخاری صاحب، حکیم سلیم اختر صاحب اور محترمہ نجمہ شاہین سے ملاقات ہوگئی۔ آپ کا ذکر بھی چھڑا۔ سلامت رہیں

مخلص/غزالی، گوجرہ

## نئی نسل میں اگر تجربے کی قوت ہے تو اس کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔

نامور نقاد، شاعر اور اردو ادب کے استاد

# ڈاکٹر تبسم کاشمیری

سے مدیرانِ ارژنگ عامر بن علی • حسن عباسی اور لبنیٰ صفدر کی گفتگو

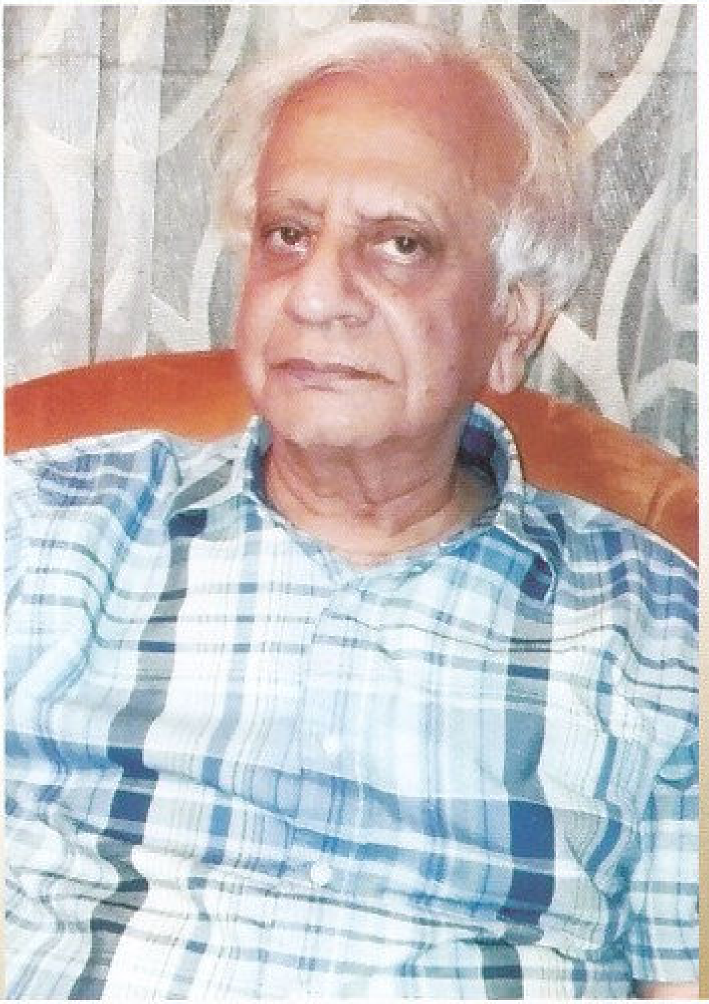

تنہائی تخلیق کا سب سے بڑا منبع ہے۔

جاپانی کلچر کے باطن کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔

**عامر بن علی:** آپ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے کچھ بتائیں تعلیم کہاں سے حاصل کی بچپن کہاں گزرا؟

**ڈاکٹر تبسم کاشمیری:** میں امرتسر میں 1940ء میں پیدا ہوا۔ یہ میرا آبائی شہر ہے۔ امرتسر کاروباری شہر تھا اس کی میں مثال دوں گا کہ متحدہ ہندوستان میں اسٹاک ایکسچینج بمبئی تھا یا امرتسر میں تھا۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ کس قدر کاروباری مرکز تھا۔ ہمارے آباؤ اجداد کشمیر سے امرتسر آئے تھے۔ امرتسر میں بہت کشمیری آباد تھے۔ امرتسر میں مسلمانوں کا کلچر کشمیریوں کا تھا۔ جب پاکستان بنا میرے والد کے خوش قسمتی سے کچھ فوجی آفیسر دوست تھے۔ انہوں نے ہمیں پہلے سے کہہ دیا تھا کہ چودہ اگست کو تیار رہیں۔ سفر کے لیے اُس دن ایک ٹرک آیا جس کے اوپر مشین گن لگی ہوئی تھی۔ اُس میں ہمیں چھپا کر امرتسر کیمپ میں لے آئے۔ انہوں نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ دودھ اور بسکٹ کے بہت سے پیکٹ دیے کہ پتہ نہیں کب حالات بہتر ہوں گے۔ یوں ہم پاکستان پہنچ گئے۔

ابتدائی تعلیم کراچی میں حاصل کی۔ میں بھائی کے ساتھ کراچی گیا تھا۔ یہ شہر اُس وقت بہت ویران اور سنسان تھا۔ ہر طرف افراتفری تھی ہمیں خود کچھ نہیں تھا۔ مستقل طور پر کس شہر میں سکونت اختیار کرنی ہے۔ کیا کاروبار کرنا ہے۔ ہم کراچی سے راولپنڈی اور پھر لاہور آئے لاہور سے میٹرک کیا۔ پھر گریجویشن کیا۔ پی ایچ ڈی کی۔

1965ء میں جاب کی ایچی سن میں پڑھایا۔ صرف 2 ماہ تک اور پھر جاب چھوڑ دی۔

یہ میرے مزاج کے مطابق نہیں تھی۔ حالانکہ جب دوسرے کالج اُس وقت 250 روپے ماہانہ دیتے تھے۔ یہ چھ سو روپے ماہانہ تنخواہ دیتے تھے۔ میرے دوست پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے تھے جب ان کو پتہ چلا تو انہوں نے کہا ایسا کیوں کیا؟ مگر یہ میرے مزاج کے مطابق نہ تھا۔ پھر میں نے مختلف ملازمتیں کیں ں۔ 1985ء میں اوساکا یونیورسٹی میں چلا گیا۔ 2005 تک وہاں پڑھاتا رہا۔ پاکستان آیا تو انہوں نے کہا۔ یونیورسٹی آف ایجوکیشن میں آجائیں۔ میں انکار کرتا رہا۔ پھر میں جی سی میں آگیا۔ پڑھنے لکھنے اور پڑھانے کے علاوہ کوئی کام نہیں آتا تھا۔

**عامر بن علی:** لکھنے کا آغاز کب کیا؟

جب میں چھوٹا تھا تو بچوں کے رسائل تعلیم و تربیت، ہدایت اور دیگر میں نظمیں بھیجا کرتے تھا جو شائع ہو جایا کرتی تھیں۔ بعد میں جب کالج پہنچا تو باقاعدہ نظمیں لکھ کر ادبی رسائل کو بھیجیں۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

ارژنگ گیلری

## نیا پن فنکار کے ذہن میں ہوتا ہے

ارژنگ گیلری کے صفحات میں نامور مصوروں اور ان کے فن پاروں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

اس ماہ کے آرٹسٹ

# آغا نثار علی خان

تحریر و تعارف: لبنیٰ صفدر

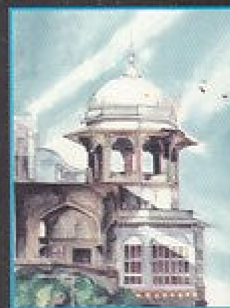

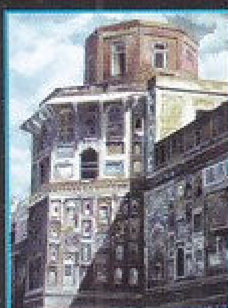

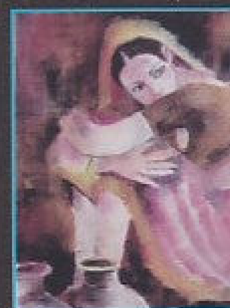
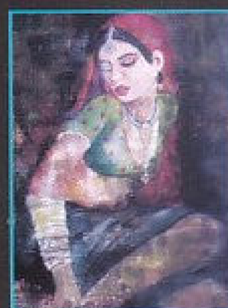

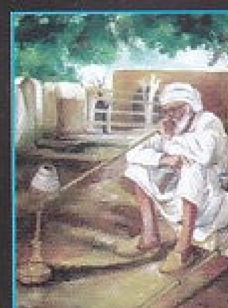
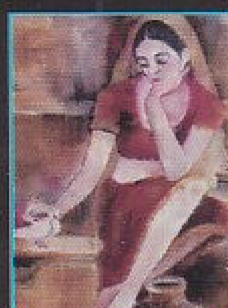

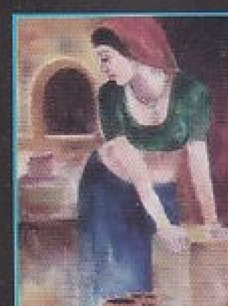
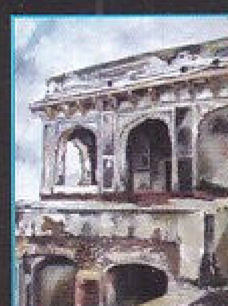

آغا نثار علی خان 15 فروری 1965ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ بطور شاعر اور آرٹسٹ وہ پاکستان میں ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر شہرت رکھتے ہیں۔ وہ ہمہ جہت فن کار اور تخلیق کار ہیں۔ اگر ان کے کام پر نظر ڈالیں تو یوں محسوس ہوتا ہے ہر پینٹنگ اُن کی منفرد سوچ کی عکاس ہے اور اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہے۔ آغا نثار کی علامتیں اعتدال پسندی میں لپٹی ہوئی ہیں۔ وہ اپنے کام میں زیادہ تر جیومیٹریکل شکلوں کا اطلاق کرتے ہیں۔ آغا نثار علی خان نے واٹر کلر کیلی گرافی کو جدت بخشی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ اُس کے نئے پن میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک واٹر کلر کیلی گرافی کا کام پاکستان میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ کینوس اور کاغذ دونوں پر اُن کا کام قابل ستائش ہے۔ آغا نثار کی پینٹنگز کی سولو نمائشیں امریکہ، انگلینڈ، اوسلو اور شارجہ کے علاوہ کئی ممالک میں متعدد بار انعقاد پذیر ہو چکی ہیں۔ وہ اردو نظم و غزل کے منفرد شاعر بھی ہیں ان کی شاعری بھی ان کی پینٹنگز کی طرح امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)